چار دیواری کی دنیا کی حقیقی کہانیاں

عنایت اللہ

چار دیواری کے دریچوں سے

فہرست

پیش لفظ

سچّی کہانیوں کا یہ مجموعہ ''چار دیواری کی دُنیا'' کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ ہماری اپنی چار دیواری کی دُنیا کی چند ایک متحرک تصویریں ہیں۔ کیا ہم میں سے کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ کہانیاں یا ان میں سے کوئی کہانی سچی نہیں ہو سکتی؟

یہ قصّے، یہ وارداتیں اور یہ آپ بیتیاں من گھڑت ہو ہی نہیں سکتیں اور یہ انوکھی اور عجیب و غریب بھی نہیں۔ ایسا ہوتا آیا ہے اور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ عجیب و غریب کچھ ہے تو یہ ہے کہ ہم سب اپنے اپنے گھر پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور دیواروں کے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں کہ یہ کچھ سُن نہ سکیں، پھر بھی دیواریں سُن لیتی اور دُوسروں کو سُنا دیتی ہیں۔ کسی گھر کا کوئی راز ڈھکا چُھپا نہیں رہتا۔

یہ کہانیاں جو ہم اس مجموعے میں پیش کر رہے ہیں، یہ سُنانے والوں نے دوسروں کی نہیں اپنی سُنائی ہیں۔ یہ اُن کے اپنے تجربات ہیں۔ اُن پر جو بیتی ہے وہ انہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر سُنا دی ہے۔ ان میں بعض کہانیاں خصوصی ذکر کے قابل ہیں لیکن ہم اپنی کوئی رائے نہیں دیں گے۔ یہ کہانیاں آپ کے رونگٹے کھڑے کر دیں گی اور آپ اپنے جذبات میں بھونچال کے جھٹکے محسوس کریں گے۔

اِن سچّی کہانیوں میں آپ اچھے کردار بھی دیکھیں گے اور بہت بُرے بھی۔ آپ کو وہ رسومات اور رواج بھی نظر آئیں گے جو ہماری چار دیواری کی دُنیا پر آسیب کی مانند طاری ہیں اور آئے دن المیہ ڈراموں کو جنم دیتے ہیں لیکن ہم حادثے، جگ ہنسائی اور اپنی بدنامی برداشت کر لیتے ہیں مگر اپنے انداز نہیں بدلتے اور اُن زنجیروں سے آزاد ہونے کی کوشش نہیں کرتے جو ہم نے خود ہی اپنے گِرد لپیٹ رکھی ہیں۔

اگر آپ یہ کہانیاں تفریحِ طبع کے لیے پڑھنا چاہتے ہیں تو آپ کو تفریح کا بہت سامان ملے گا لیکن ان کہانیوں میں انسان کی نفسیات، سوشیالوجی اور نیکی اور بدی کا فلسفہ بھی ملے گا۔

کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ بہترین منصف آپ ہیں۔ آپ ہی بتا سکتے ہیں کہ یہ کہانیاں کیسی ہیں۔ اگر آپ مجھے بھی اپنی رائے سے آگاہ کر دیں تو یہ ہماری راہنمائی ہوگی۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

اور وہ میری بیوی بن گئی

بات چہلم سے شروع ہوئی — اور میں خدا کے حضور دعائیں مانگنے لگا کہ ایسا ہی ایک چہلم اور ہو، خواہ میری ماں کا ہی ہو۔ میری قسمت جس طرح بگڑ گئی تھی وہ کسی اور کے چہلم سے ہی سنور سکتی تھی۔ ایک علاج یہ بھی تھا کہ میں ہی اس دُنیا سے اُٹھ جاتا۔

کبھی میں بھی کسی کے گھر کی کوئی اُلٹی سیدھی بات سُنا کرتا تو کہا کرتا تھا کہ نہیں، یہ ان کے کسی دشمن کا من گھڑت قصّہ ہے۔ یوں نہیں ہوتا۔ اب میں آپ کو وہ واردات سُناؤں گا جو میرے ساتھ ہوئی تھی تو آپ کہیں گے کہ چار دیواری کی دُنیا میں ہوتا تو بہت کچھ ہے لیکن یوں نہیں ہوتا۔ مجھ پر جو بیتی ہے وہ آپ سُن لیں، پھر آپ جو رائے چاہیں قائم کریں۔

میرے والد میرے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ جس قصبے میں ہم رہتے ہیں وہاں ہماری پوزیشن اس لحاظ سے اچھی تھی کہ مکان اپنا تھا۔ تھوڑی سی زمین بھی تھی جس سے دانے آجاتے تھے اور اس کے چارے اور بھوسے پر میری ماں نے ایک بھینس رکھ لی تھی۔ گھر کے ہم دو ہی افراد تھے۔ ایک ماں، دوسرا میں۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ میرے والد کا چہلم کیسے ہُوا تھا۔ دستور اور رواج کے مطابق ویسے ہی کی طرح ہُوا ہوگا۔ میری ماں نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ میں نے اُس سے کبھی نہیں پوچھا تھا کہ اُس نے دوسری شادی کیوں نہیں کی تھی۔ پوچھتا تو وہ یہی کہتی کہ تمہاری خاطر نہیں کی تھی۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ وہ جوانی میں بیوہ ہوتی تھی۔ اُس کے ساتھ شادی کرنے والوں نے اس کا ناک میں دم کر دیا

ہوگا۔ وہ یتیم تھی۔ اُس کا بھائی بھی کوئی نہیں تھا۔ اُس نے معلوم نہیں کس طرح
[illegible] کا مقابلہ کیا ہوگا۔

میں اپنے متعلق بتا دوں کہ میری طبیعت بالکل سیدھی ہے۔ ہیر پھیر نہیں
آتا اور نہ ہی میں دوسروں کے ہیر پھیر کو سمجھ سکتا ہوں۔ کوئی سیدھی بات کہے تو
فوراً سمجھ لیتا ہوں اور کوئی اپنا مطلب نکالنے کے لئے گھما پھرا کر بات کرے تو
بغیر سمجھے اُس کی بات مان لیتا ہوں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں صاف دل،
نیک اور پارسا ہوں۔ آپ کو صرف یہ بتا رہا ہوں کہ ہر کسی کو اپنے جیسا سمجھتا ہوں
اور میری بدنصیبی کا باعث بھی یہی ہے۔ مجھ میں بچوں اور لڑکوں والی شوخی بھی نہیں
تھی، اس لئے میں گلیوں میں کبھی نہیں کھیلا تھا۔ ماں بھی مجھے باہر جانے سے منع
کیا کرتی تھی۔ میں اُس کا واحد اور یتیم بچہ تھا۔ وہ زیادہ تر اپنے ساتھ ہی مجھے
چپکائے رکھتی تھی۔ اس کا بھی اثر تھا کہ میں دُنیا کو سمجھ سکا، نہ دُنیا کے انسانوں
کو۔ میں آج سنجیدہ عمر میں آکر کہتا ہوں کہ میں ماں کا قیدی تھا۔ لڑکپن میں مجھے
یہ قید بُری نہیں لگی تھی۔

ماں نے مجھے کبھی نہیں بتایا تھا کہ میرے والد کی طبیعت کیسی تھی۔ دوسروں
سے پتہ چلا تھا کہ وہ طبیعت کے سخت تھے اور اُن کی فطرت مجھ سے اُلٹ تھی۔
میری ماں نے میرے سامنے انہیں کبھی یاد نہیں کیا تھا۔ میں جب اُن کا نام لیتا
تو میری ماں کے انداز میں بے رُخی سی ہوتی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میرے
والد کے ساتھ خوش نہیں تھی۔ شاید یہ بھی ایک وجہ تھی کہ اُس نے دوسری شادی
نہیں کی تھی۔ وہ شادی کے نام سے ہی گھبراتی ہوگی۔ میں کہتا ہوں کہ اُس نے اپنے
آپ پر بھی زیادتی کی تھی اور مجھ پر بھی۔ اُس نے دوسری شادی نہ کرکے اپنے
جذبات کو مارا اور ساتھ ہی مجھے پالتو بلی بنا کر میری شخصیت کو پختہ نہ ہونے دیا۔ سوتیلا
باپ میرے ساتھ بدسلوکی کرتا تو میں چالاک اور ہوشیار ہو جاتا اور میں زمانے
کی ہیرا پھیریوں کو سمجھنے کے قابل ہو جاتا۔

ماں نے یہ کرم کیا کہ مجھے اعلیٰ تعلیم دلانے کا پختہ عزم کر لیا۔ وہ مجھے بڑا آدمی
بنانا چاہتی تھی۔ وہ شاید مجھے اس لئے بھی سیدھا سادا اور بُدھو بنانا چاہتی ہو کہ میں اپنے

باپ کی طرح اکھڑ مزاج یا جیسا وہ تھا ویسا ہی نہ بن جاؤں۔ میرے دل میں پڑھنے کا
شوق پیدا ہو گیا اور میں نے تعلیم سے ماں کی طرح محبت کی۔ یوں کہہ لیں کہ میں چاردیواری
کی قید سے کتابوں کی قید میں منتقل ہو گیا۔ معاشی اور معاشرتی لحاظ سے میں درمیانے
طبقے کا فرد تھا۔ یہی طبقہ رسم و رواج میں جکڑا ہُوا ہوتا ہے۔

میرے والد کی ایک بہن تھی جو اُن سے بڑی تھی۔ میری اس پھوپھی کی
ایک بیٹی تھی جس کی عمر مجھ سے دو تین سال زیادہ تھی۔ پھوپھی ہماری تحصیل کے
ہی ایک قصبے میں رہتی تھی۔ پھوپھا وہاں کے رہنے والے تھے۔ میری دادی انہی
کے ساتھ رہتی تھی۔ پھوپھی کبھی کبھی ہمارے ہاں آتی، دو چار روز رہتی اور وہ میرے
ساتھ بہت پیار کرتی تھی۔ میری ماں صبر اور شکر سے زندگی بسر کرنے والی
سیدھی سی عورت تھی۔ میں جب لڑکپن میں پہنچا تو پھوپھی مجھے زیادہ پسند آنے
لگی۔ ایک تو اُس کی شکل و صورت میری ماں کی نسبت اچھی تھی۔ رنگ کچھ کچھ
سفید تھا، لیکن وہ مجھے اچھی اس لئے لگتی تھی کہ باتیں بہت دلچسپ کرتی تھی۔
بات کیسی ہی ہو اُسے وہ دلچسپ بنا کر سناتی تھی۔ دوسروں کے گھروں کے
قصے زیادہ سناتی اور مزے لے لے کر سناتی تھی۔ میں یہ بھی محسوس کرنے لگا
کہ وہ چلی جاتی تو گھر کی رونق بھی اُس کے ساتھ ہی چلی جاتی تھی۔

میری ماں اُسے پسند نہیں کرتی تھی۔ اُس کے متعلق ماں کا یہ رویّہ
مجھے پسند نہیں تھا۔ اُس کے جانے کے بعد محلے کی عورتیں ہمارے گھر آتیں،
پھوپھی کے متعلق پوچھتیں کہ چلی گئی ہے؟ میری ماں اُس کے خلاف بہت باتیں
کرتی اور عورتیں اُس کی تائید میں ایک دو گھناؤنے سے قصے سنا دیتی تھیں۔
میں نے ایک بار ماں سے جھنجھلا کر کہا کہ پھوپھی اتنی اچھی ہے، تم اُسے پسند
کیوں نہیں کرتیں؟ ماں نے کہا کہ تم نہیں جانتے، بہت چالاک اور مکار عورت
ہے۔ اس نے اپنے خاوند کو نکیل ڈال رکھی ہے۔ آسمان سے تارے توڑ لاتی
ہے۔ بڑے بڑے اُستاد مردوں کے کان کاٹتی ہے۔ اسے جو لوگ پسند
نہیں کرتے وہ بھی اس کی باتوں میں آجاتے ہیں۔

ماں کی یہ رائے مجھے متاثر نہ کر سکی۔ میں کچھ بھی نہ سمجھ سکا، بلکہ میں یہ بھی

پھوپھی کی خوبی سمجھنے لگا کہ وہ چالاک اور مکار ہے۔ میری دادی بہت بوڑھی ہو گئی تھی۔ ہمارے گھر آنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ گاڑی کا سفر نہیں کر سکتی تھی۔ میری ماں پھوپھی کے گھر کبھی ماتم یا شادی پر گئی ہو گی، محض ملنے ملانے کے لئے کبھی نہیں گئی تھی۔ میرے پھوپھا کبھی کبھار آتے تھے۔ وہ خاموش طبیعت کے انسان تھے اور کچھ مجھ سے ملتے جلتے تھے۔

میں نے میٹرک پاس کر کے ایف۔ اے کیا اور انجینیرنگ کی ڈگری کے پیچھے پڑ گیا۔ میرا رجحان اسی طرف تھا۔ محنت کی اور یہ ڈگری بھی لے لی۔ اُس وقت ڈگری یافتہ انجینیروں کی کمی تھی۔ مجھے تھوڑی سی کوشش سے سرکاری ملازمت مل گئی۔ میں نے ماں کا خواب پورا کر دیا۔ اُس نے مجھ پر کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ میری تعلیم کے اخراجات کس طرح پورے کرتی رہی ہے۔ مجھے کوئی اور شوق تو تھا نہیں۔ لاہور جیسے شہر میں، ہوسٹل میں رہتے ہوتے بھی میں نے اپنے ساتھیوں کی طرح فیشن نہ کیا۔ سینما کی عادت نہ ڈالی اور کپڑے معمولی پہن کر وقت گزارا۔ ضروریات کے لئے ماں سے جب بھی اور جتنے بھی پیسے مانگے اُس نے دے دیتے۔

ملازم ہوتے ابھی چھ مہینے گزرے ہوں گے کہ دادی کی وفات کی اطلاع ملی۔ میں اپنی نوکری میں تھا۔ مجھے ماں نے خط لکھا تھا کہ دادی فوت ہو گئی ہے اور وہ وہاں جا رہی ہے۔ میں نے پھوپھی کو افسوس کا خط لکھ دیا۔ دس بارہ دنوں بعد مجھے پھوپھا کا خط ملا۔ اُس نے لکھا تھا کہ میری پھوپھی کی دلی خواہش ہے کہ میں دادی کی وفات پہ تو نہ پہنچ سکا، اُس کے چہلم پر ضرور آؤں۔ اُنہوں نے چہلم کی تاریخ بھی لکھ دی۔ میں نے دس دنوں کی چھٹی کا انتظام پہلے سے ہی کر لیا لیکن ماں کو نہ لکھا کہ میں بھی دادی کے چہلم پر جا رہا ہوں۔

میں چہلم کی تاریخ سے دو روز پہلے ہی گھر چلا گیا۔ ماں کو بتایا کہ میں چہلم

پر جانے کے لئے آیا ہوں۔ ماں اس طرح خاموش ہو گئی جیسے اُسے میری یہ بات پسند نہ آئی ہو۔ میں نے ماں سے خاموشی کی وجہ پوچھی تو اُس نے کہا کہ تمہاری کوئی ضرورت تو نہیں تھی۔ اب آ گئے ہو تو چلے چلنا۔ جانا تو میں بھی نہیں چاہتی لیکن دُنیا کو بھی مُنہ دکھانا ہوتا ہے، جانا ہی پڑے گا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ماں نہیں چاہتی کہ میں وہاں جاؤں لیکن اب وہ مجھ پر اُس طرح حکم نہیں چلا سکتی تھی جس طرح لڑکپن میں چلایا کرتی تھی۔ میں اب اس کا کماؤ بیٹا تھا، اس لئے بھی میرا احترام کرنے لگی تھی۔

ہم چہلم کے روز صبح کی گاڑی میں بیٹھے اور پھوپھی کے قصبے میں جا اُترے۔ میں پہلی بار پھوپھی کے گھر داخل ہُوا۔ وہ تو کھاتے پیتے لوگ تھے۔ ان کا گھر ہمارے گھر کی نسبت بہت اچھا تھا۔ میں نے پہلی بار اپنی پھوپھی زاد بہن کو دیکھا۔ ماں کی طرح اچھی شکل و صورت اور ہنستی کھیلتی طبیعت والی تھی۔ پھوپھی تو میری بلائیں لیتے نہ تھکتی تھی۔ وہاں مہمانوں کا یہ عالم تھا جیسے شادی ہو رہی ہو۔ دروازے کے سامنے دیگوں کی قطار آگ پر رکھی تھی۔ ایک کمرے میں ایک مولوی صاحب اور اُس کے شاگرد قرآن پڑھ رہے تھے۔ جُوں جُوں دن گزرتا جا رہا تھا مہمان بڑھتے جا رہے تھے۔ عورتیں بچوں سمیت آ رہی تھیں۔

مردوں کے کھانے کا انتظام ساتھ والے گھر کے صحن میں کیا گیا تھا۔ یہ تو ضیافت تھی۔ ہماری برادری کے ایک دو گھر ہی تھے، باقی مہمان محلّے کے اور میرے پھوپھا کے ملنے والے تھے۔ یہ اہتمام محض نمائش کے لئے کیا جا رہا تھا۔ مہمانوں میں سے کوئی بھی ختمِ قرآن اور درود فاتحہ میں شریک نہ ہُوا۔ سب کھانے کا انتظار کر رہے تھے۔ کھانا آیا تو سب ٹوٹ پڑے۔ میرے پھوپھا کی دی ہوئی یہ ضیافت کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہمارے معاشرے میں نمود و نمائش کے لئے اور ناک کے تحفّظ کے لئے لوگ بیاہ شادیوں اور چہلم وغیرہ پہ اسی طرح روپیہ پیسہ تباہ کرتے اور مقروض ہوتے ہیں۔ مدعوّین کا رویّہ یہ ہوتا ہے کہ کھا پی کر بھی باتیں بناتے اور نکتہ چینی کرتے ہیں۔ وہ عموماً اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ فلاں اتنا غریب ہے لیکن اُس نے ان سے زیادہ اچھا ولیمہ دیا یا چہلم کیا تھا۔ ایسا ایک بھی نہیں ہوتا

جو کسی غریب سے کہے کہ نہ بھائی، تم ان بے بنیاد رسموں کے قابل نہیں ہو۔ بیکار پیسہ خرچ نہ کرنا۔

چونکہ یہ کھانے پینے والے مہمان جانتے ہیں کہ کل پرسوں انہیں بھی یہ رسمیں پوری کرنی پڑیں گی اس لئے وہ دوسروں سے بڑھ چڑھ کر خرچ کرتے ہیں مگر لوگوں کی باتوں اور تنقید سے بچ نہیں سکتے۔ میں سمجھ نہیں سکتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ لوگوں کا رویّہ اتنا ظالمانہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بال بچّوں کو بھی ساتھ لاتے ہیں اور اتنا زیادہ کھاتے ہیں جیسے کتی روز کے بھُوکے ہوں۔ ہر گھر سے ایک آدمی بلایا جاتا ہے لیکن پورا کنبہ آجاتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے نہ جہلم کرنے والوں کو خیال ہے کہ اُن کے گھر کا ایک فرد مر گیا ہے نہ جہلم کی دعوت اُڑانے والوں کو۔ ہم اپنی بدبختیوں کے ذمّہ دار خود ہیں اور ہماری سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، یہ ہمارے مذہب کے منافی ہے اور جو قرآن ہم جہلم پر مولوی اور اُس کے پیشہ ور شاگردوں سے ختم کراتے ہیں اس میں اللہ اور اللہ کے رسول صلعم کا یہ حکم بڑا صاف ہے کہ یہ بے جا اخراجات گناہ ہیں۔

مگر جو معاشرہ اس سے زیادہ گھناؤنے جرائم اور کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کر سکتا ہے وہ بے جا اخراجات کے خلاف کیسے بات سُنے گا۔ میں اور چار دیواری کی دنیا کی ایک لڑکی ایسے ہی ایک گناہ کا شکار ہوتے ہیں۔ یہ واردات یوں ہوتی کہ دادی کے جہلم کا جشن ختم ہُوا۔ مقامی مہمان رخصت ہو گئے۔ باہر سے جو بلائے گئے تھے وہ صبح ناشتہ کر کے رخصت ہوئے۔ میری ماں تیار ہونے لگی تو پھوپھی اُس سے بغل گیر ہو گئی۔ اُس کے آنسو بہنے لگے۔ کہنے لگی کہ میرے بھائی کی نشانی کو (یعنی مجھے) تم پہلی بار میرے گھر لائی ہو۔ اسے یہاں دیکھ کر مجھے اپنا بھائی اتنا یاد آیا ہے کہ ساری رات آنکھ نہیں لگی، روتی رہی ہوں۔ خدا کے لئے مجھ پہ رحم کرو۔ اسے دو تین دنوں کے لئے یہیں رہنے دو۔ تم بھی رہ سکتی ہو تو رہ جاؤ، لیکن میں تمہیں روکوں گی نہیں۔ پیچھے تمہارا گھر خالی پڑا ہے۔ زمانہ بڑا خراب ہے۔

مختصر یہ کہ پھوپھی کے آنسوؤں اور اُس کی جذباتی باتوں نے سب پر ایسا اثر کیا کہ میرے بھی آنسو نکل آئے۔ میری ماں اور پھوپھا کا بھی یہی حال ہُوا۔ پھوپھی بَین کرنے لگی اور اُس نے مجھے گلے لگا لیا۔ میری جذباتی حالت بگڑنے لگی۔ پھوپھا نے میری ماں سے کہا کہ شفقت کو دو تین دنوں کے لئے یہیں چھوڑ جاؤ ورنہ یہ (پھوپھی) پاگل ہو جائے گی۔ اس کے دل میں ماں کے مرنے کا دُکھ بھی ہے۔

میری ماں میں ذرا سی بھی چالاکی نہیں تھی۔ اب تو وہ بھی جذبات میں آگئی تھی۔ اُس نے مجھے باقی چھُٹی وہیں گزارنے کی اجازت دے دی۔ میری چھُٹی کے ابھی چھ سات روز باقی تھے۔ ماں نے یہ قربانی دی تھی۔ ملازمت نے مجھے اُس سے جُدا کر دیا تھا۔ اُس کی بجا طور پر خواہش تھی کہ میں ساری چھُٹی اُس کے ساتھ گزاروں۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ مجھے کوارٹر مل جائے تو ماں کو ساتھ رکھوں مگر سرکاری کوارٹر کا نمبر ابھی دُور تھا اور مکان میری پسند کا نہیں مل رہا تھا۔ ماں کو میں پھوپھی کے گھر سے سٹیشن تک لے گیا۔ گاڑی آئی اور میں نے اُسے گاڑی میں بٹھا دیا۔ انجن نے وِسل دی تو ماں نے مجھے کہا ــــ ”ایک دو دن رہ کر آجانا۔ دو تین دن میرے پاس گزارنا .... اور خیال رکھنا کہ پھوپھی بڑی چالاک ہے۔ اس نے ایک بار مجھے کسی کی زبانی پیغام بھیجا تھا کہ میں اس کی بیٹی کا رشتہ تمہارے لئے لینے آؤں۔“

ماں شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی لیکن گاڑی چل پڑی تھی۔ میں آہستہ آہستہ گاڑی کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ گاڑی تیز ہونے لگی تو ماں نے کہا ــــ ”یہ اس کی بڑی پُرانی خواہش ہے۔ کہتی ہے کہ تیرے ابا کی بھی یہی خواہش تھی، جب تم پیدا ہوئے تھے ....“ ماں بات پوری نہ کر سکی۔ گاڑی تیز ہو گئی تھی اور میرے آگے پلیٹ فارم پر کسی کا سامان پڑا تھا۔ مجھے رُکنا پڑا۔ گاڑی چلی گئی اور میں اپنی شادی کے متعلق سوچنے لگا۔

مَیں نے اس سے پہلے شادی کے متعلق کبھی نہیں سوچا تھا۔ میری توجہ اپنی ماں پر مرکوز رہتی تھی۔ اس نے میرے لئے اپنی جوانی اور اپنا مستقبل قربان

لیا تھا۔ اس رُتبے تک مجھے ماں نے پہنچایا تھا۔ میں سب سے پہلے ماں کا حق اُس کی خدمت کر کے ادا کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھا۔ میں لاہور میں مکان کی تلاش اسی کو ساتھ رکھنے کے لئے کر رہا تھا۔ اب ماں میرے کان میں یہ بات ڈال گئی کہ پھوپھی مجھے اپنا داماد بنانا چاہتی ہے اور میں پیدا ہوا تھا تو میرے والد نے بھی اسی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ شادی کے معاملے میں میری اپنی کوئی پسند نہیں تھی، بلکہ یہ کہہ لیں کہ کوئی ارادہ بھی نہیں تھا، لیکن پھوپھی اور والد مرحوم کی خواہش میرے دماغ پر سوار ہو گئی۔ پھوپھی سے میں ویسے ہی متاثر تھا اور میں اپنے والد کی روح کو بھی خوش کرنا چاہتا تھا۔ میں نے یہ ارادہ کیا کہ ماں سے کہوں گا کہ پھوپھی کے ہاں جا کر اس کی بیٹی کا رشتہ مانگ لو۔

میں ماں کو رخصت کر کے پھوپھی کے گھر کی طرف جا رہا تھا تو میں تصوروں میں اپنی شادی کرتا جا رہا تھا۔ یہ تو میں نے طے کر لیا تھا کہ شادی پھوپھی کی بیٹی سے ہوگی۔ وہ مجھ سے دو تین سال بڑی تھی۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ میں جس بات پر پریشان ہو رہا تھا وہ یہ تھی کہ شادی میں اُن ہنگاموں اور رسم و رواج سے نہیں کرنا چاہتا تھا جن کے بغیر لوگ کہتے ہیں کہ ناک کٹ جاتی ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک اور حدیث میں لکھا ہے۔ اس کے مطابق میں لوگوں کو نہیں خدا اور رسول صلعم کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ یہ مجھے ناممکن نظر آ رہا تھا۔ جس پھوپھی اور پھوپھا نے دادی کے چہلم پر دیگیں پکوا کر لوگوں کو کھلا دی تھیں، ان سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی خاموشی سے کریں گے اور ہمیں بھی خاموشی سے بارات لانے دیں گے۔

پھوپھی کے گھر سے مہمان جا چکے تھے۔ میں ان کا ایک ہی مہمان رہ گیا تھا۔ پھوپھا کا وقت اپنے کمرے میں لیٹے اور حقہ پیتے گزرتا تھا یا وہ باہر چلے جاتے اور اپنے جیسے سیدھے سادے لوگوں کی محفلوں میں گپ شپ لگا کر دو چار گھنٹے گزار آتے تھے۔ گھر میں پھوپھی اور اُس کی بیٹی رہ گئی تھیں۔ طبیعت کے لحاظ سے ماں بیٹی ایک جیسی تھیں۔ میں پہلی بار اپنی پھوپھی زاد کو دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھ میں گہری دلچسپی لے رہی تھی۔ پھوپھی میرے آگے بچھی جا رہی تھی۔ میرے جذبات

اور میری رگیں کچی تھیں۔ میں ایک ہی دن میں ان کا گرویدہ ہو گیا۔ پھوپھی سے تو میں پہلے ہی متاثر تھا۔ پھوپھی یہ الفاظ بار بار کہتی تھی ——"تم تو میرے بیٹے ہو"

رات کے شاید نو بج رہے تھے۔ پھوپھی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ وہ دروازے میں رُک گئی۔ اُس کے مُنہ سے "ہائے، میں گئی" نکلا اور وہ کواڑ کا سہارا لے کر وہیں جھک گئی۔ میں نے دوڑ کر اُسے سہارا دیا اور پلنگ پر لٹایا۔ اُس کی بیٹی اور پھوپھا دوڑے آئے۔ پھوپھی نے دل کے مقام پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ شاید غشی میں تھی۔ ہم سب گھبرا گئے۔ میں نے پھوپھا سے پوچھا کہ انہیں پہلے کبھی ایسی تکلیف ہوتی ہے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ اس کی بیٹی نے کہا کہ ہم نے ابا جان کو کبھی نہیں بتایا کیونکہ یہ گھبرا جاتے ہیں۔ امی کو یہ تکلیف پہلے بھی ہو چکی ہے اور امی ایک حکیم سے علاج کرا رہی ہے۔

اُس وقت میری عمر بائیس سال سے دو چار مہینے اُوپر ہوئی تھی۔ مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اگر پھوپھا گھبرائے تھے تو میں اُن سے زیادہ گھبراہٹ میں تھا۔ پھوپھی نے تڑپنا اور کراہنا شروع کر دیا۔ پھوپھا ایک ڈاکٹر کو گھر سے بلا لائے۔ مجھے یہ شخص ڈاکٹر نہیں لگتا تھا۔ اُس کی باتیں ڈاکٹروں والی نہیں تھیں۔ اُس نے ایک انجکشن لگا دیا اور باہر آ کر اُس نے مجھے اور پھوپھا کو بتایا کہ یہ دل کا حملہ ہے۔ یہ ٹل بھی سکتا ہے اور اس کا انجام کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ انہیں ایک تو آرام اور سکون کی ضرورت ہے اور کوئی ایسی بات نہ کی جائے جس سے ان کے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ مجھے یاد ہے کہ پھوپھی نے سرگوشیوں میں ڈاکٹر کو اپنی تکلیف بتائی تھی۔ ڈاکٹر چلا گیا۔ بہت دیر بعد پھوپھی نے مریل آواز میں پھوپھا سے کہا کہ آپ آرام کریں، آپ چہلم کے انتظامات میں بہت مصروف رہے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو بھی تکلیف ہو جائے۔ میں نے بھی پھوپھا سے کہا کہ وہ جا کر آرام کریں۔

میں پھوپھی کے پاس اکیلا رہ گیا۔ اُس کی بیٹی کو اُس کے کمرے میں سونا تھا۔ معلوم نہیں وہ کہاں چلی گئی تھی۔ پھوپھی نے مجھے اپنے پاس پلنگ پر بٹھا لیا اور نحیف آواز میں کہنے لگی ——"میں تمہارے پھوپھا کے دل کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتی۔ انہیں میں نے اپنی یہ تکلیف کبھی نہیں بتائی تھی۔ اب میں نے محسوس کر لیا ہے کہ

اس حملے سے بچ نہیں سکوں گی۔"

میں اُسے تسلّی دینے لگا تو اُس نے مجھے روک دیا، رُک رُک کر بڑی دبی دبی آواز میں کہنے لگی —— "ان تسلیوں کا وقت گزر چکا ہے۔ ہو سکتا ہے میں بولتے بولتے ختم ہو جاؤں۔ میری آخری خواہش پوری کر دو۔ تب کچھ اُمید ہو سکتی ہے کہ میں شاید بچ جاؤں .... تم جب پیدا ہوتے تھے تو میرے بھائی (میرے والد) نے مجھے کہا تھا کہ تمہاری بیٹی میرے بچّے سے اڑھائی تین سال بڑی ہے، پھر بھی میرے ساتھ وعدہ کرو کہ یہ تم میرے بیٹے کو دو گی۔ تم میری اکیلی بہن ہو اور میں تمہارا اکیلا بھائی ہوں۔ میری خواہش ہے کہ ہم دونوں کی نسل آگے بڑھے اور پھلے پھُولے۔"

میں نے پھوپھی کو زیادہ بولنے سے روکنا چاہا — اس سے تکلیف بڑھنے کا خطرہ تھا لیکن پھوپھی نے کہا —— "میری پوری بات سُن لو۔ میں چُپ ہو گئی تو ایسا نہ ہو کہ تم ساری عمر پچھتاتے رہو کہ پھوپھی معلوم نہیں اور کیا کہنا چاہتی تھی۔ میں قبر سے نکل کر بات پوری کرنے نہیں آ سکوں گی۔ خدا کو شاید یہی منظور تھا کہ تم جہلم پر آ گئے اور میں نے تمہیں روک لیا۔ یہ سبب خدا نے بنایا ہے .... میں نے تمہارے باپ سے وعدہ کیا تھا کہ اپنی بیٹی تمہارے بیٹے کو دُوں گی۔ تم ابھی ایک سال کے نہیں ہوتے تھے کہ ایک روز اطلاع ملی کہ تمہارا باپ بیمار ہے اور آخری دموں پر ہے۔ میں تمہارے گھر پہنچی۔ میرا اکلوتا بھائی میرے ہی انتظار میں تھا۔ اُس نے تمہیں تمہاری ماں کی گود سے لے کر میرے ہاتھوں پر رکھ دیا اور کہا کہ میری وصیت ہے کہ یہ بچّہ تمہارا ہے اور میرے اس گھر میں صرف تمہاری بیٹی آئے گی۔"

میرے آنسو نکل آئے۔ مجھے اپنے والد مرحوم یاد آ گئے جنہیں میں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اُس وقت میری عمر نو دس مہینے تھی۔

پھوپھی مری مری آواز میں سانس لے لے کر کہہ رہی تھی —— "میں نے اپنے بھائی کو اسی طرح تسلیّاں دیں جس طرح تم مجھے دے رہے ہو۔ لیکن موت نے مجھ سے میرا بھائی چھین لیا۔ تم ابھی میری گود میں ہی تھے کہ تمہارے باپ کی

آنکھیں پتھرا گئیں اور پھر میں نے اُس کی آنکھیں بند کر دیں۔ میں نے قسم کھائی کہ اپنی بیٹی تمہیں دُوں گی، خواہ تم جوان ہو کر اندھے لنگڑے ہو گئے، خواہ تم بھکاری اور بے روزگار ہوتے تو بھی اپنی بیٹی تمہیں ہی دوں گی .... اللہ نے رحم کیا کہ تم جوان ہو گئے۔ میری بیٹی بڑی تھی۔ رشتے مانگنے والوں نے ناک میں دم کر دیا لیکن میں نے ایک نہ زبان پر رکھی۔ فوج کے کپتان بھی رشتے کے لئے آتے۔ میں نے صاف جواب دیا۔ اب میری بیٹی چھبیس سال کی ہو گئی ہے۔ اتنی دیر تک بیٹی کو کون گھر بٹھائے رکھتا ہے۔ میں نے اسے تمہارے لئے بٹھا رکھا ہے۔ میں نے تمہیں جو کچھ بتایا ہے اس سے تمہاری ماں اچھی طرح واقف ہے۔ اُس نے مجھے ہمیشہ کہا ہے کہ میرا شفقت تمہارا بیٹا بنے گا اور میں اپنے خاوند کی وصیّت پوری کروں گی۔ میں پچھلی بار تمہارے گھر تمہارے ملازم ہونے کی مبارک دینے گئی تھی تو تمہاری ماں سے کہا تھا کہ اب شادی ہو جانی چاہیئے۔ تمہاری ماں نے کہا تھا کہ پہلے تو میں بیٹے کو پڑھاتی رہی ہوں، اب اس کی تنخواہ آنے لگے گی تو اس کی شادی کے لئے زیور اور کپڑے بنانے شروع کر دوں گی۔ میں بھی یہی چاہتی تھی کہ شادی پوری تیاری سے کی جائے۔ تم بھی ماں کے ایک ہی بیٹے ہو اور میری بیٹی بھی اکیلی ہے۔ میں بھی تمہاری ماں کی طرح سارے ارمان ایک ہی بار اس طرح پورے کرنا چاہتی تھی کہ سارا شہر ہمیشہ یاد رکھتا۔"

میں اُسے کہنے ہی لگا تھا کہ میں ارمان پورے کرنے پر پیسہ تباہ کرنے کا قائل نہیں، لیکن وہ خود ہی بول پڑی —— "... مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور ہے۔ اب تو میں صرف یہ دیکھنے کے لئے زندہ رہنا چاہتی ہوں کہ میری بیٹی تمہاری دُلہن بن گئی ہے"— وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی اور اُس نے پھر ہاتھ دل پر رکھ کر تڑپنا اور کراہنا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھیں کبھی بند ہو جاتیں اور کبھی اس طرح کھُل جاتیں جیسے ڈھیلے باہر آ جائیں گے۔ اس کی بیٹی اندر آ گئی۔ ماں کو دیکھ کر وہ رونے لگی۔

"پھوپھا سے کہتا ہوں کسی دوسرے ڈاکٹر کو بلا لائیں"—— میں نے

گھبرا کر کہا۔

"نہیں" — پھوپھی نے کراہتے ہوئے کہا اور میرا بازو پکڑ کر اپنے قریب کر لیا — "اب میرے ڈاکٹر تم ہو۔ اگر تم نے میری بیٹی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو اس کا پہلا اثر یہ ہوگا کہ میرا دل جواب دے جائے گا۔ پھر میری بیٹی پیچھے رہ جائے گی اور ساری عمر اسی گھر میں بیٹھی رہے گی۔ اس کا رشتہ مانگنے والوں کو میں جواب دے چکی ہوں کیونکہ بیٹی کو میں نے تمہارے لئے پالا تھا۔ میری روح کو کبھی چین نہیں آئے گا نہ میری روح تمہیں چین لینے دے گی۔"

"میں نے کب انکار کیا ہے پھوپھی!" — میں نے کہا — "آپ دل کو تسلی دیں۔ میں گھر پہنچتے ہی ماں سے کہوں گا کہ آپ کے پاس آ کر دن مقرر کر لے۔ انشاء اللہ تیاری جلدی ہو جائے گی۔ آپ دل پر بوجھ نہ رکھیں۔ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔"

اُس کی بیٹی نے بھی میری تائید کرتے ہُوئے اُسے یہی کہا جو میں نے کہا تھا۔

"مجھے اشارہ مل چکا ہے نیک بختو!" — پھوپھی نے کراہتے ہوئے کہا — "میں کل کا دن اس دُنیا میں نہیں گزاروں گی۔"

"پھر مجھے بتائیں میں کیا کروں؟" — میں نے پوچھا — "کہیں تو رات کی گاڑی سے گھر چلا جاتا ہوں۔ کل صبح ماں کو ساتھ لے آؤں گا۔"

"وہ کہے گی کہ میں تیاری کر لوں" — پھوپھی نے روتے اور کراہتے ہوئے کہا — "میں تو کہتی ہوں کہ کل تمہاری شادی ہو جائے .... بیٹا، کہہ دو ہاں پھوپھی کل میری شادی کر دو۔"

"شادی؟" — میں نے حیران ہو کر کہا — "کل ہی؟"

"اگر مجھے زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو کل مولوی اور دو چار آدمیوں کو بُلا لیں گے اور نکاح ہو جائے گا۔ میری بیٹی کو اپنے ساتھ لے جانا۔ میں مر گئی تو سکون سے مروں گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیٹی کو تمہارے ساتھ جاتا دیکھ کر میری عمر لمبی ہو جائے" — وہ اور زیادہ تڑپنے اور کراہنے لگی۔ بڑی مشکل سے اُس کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے — "بیٹا! کہہ دو میں کل یہیں شادی کر لوں گا۔"

اُس کی بیٹی ماں کے اُوپر گر پڑی اور وہ بھی رونے لگی۔ میں سر سے پاؤں تک کانپنے لگا۔ پھوپھا اپنے کمرے میں بڑے مزے کی نیند سو رہا تھا۔

"خدا کے لئے میری امّی کی بات مان لیں" — اُس کی بیٹی نے مجھے روتے ہُوئے کہا — "نہیں تو یہ مر جائے گی۔ یہ مر گئی تو میں سمجھوں گی کہ میرا باپ بھی مر گیا ہے۔"

"میں اپنی ماں کو تو لے آؤں" — میں نے کہا — "اُس کے بغیر شادی کیسے ہو گی۔"

"وہ میرے مرنے کے بعد ہی آئے گی شفقت بیٹا!" — پھوپھی نے تکلیف سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "یہ سب جھُوٹی رسمیں ہیں۔ وہ خوش ہو گی کہ کسی رسم اور خرچ کے بغیر یہ فرض ادا ہو گیا ہے۔ وہ تو ہاں کہہ چکی ہے۔ کل وہ یہاں تھی تو بھی اُس سے بات ہوئی تھی۔ وہ ہر طرح رضامند ہے۔ کہتی تھی کہ آپ بڑی ہیں۔ جیسے چاہیں کریں۔"

یہ وہ پھوپھی تھی جسے میں اس لئے چاہتا تھا کہ ہنس مُکھ اور دلچسپ باتیں کرنے والی عورت ہے۔ اسے میں اس اذیّت میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کی شادی کی تجویز بڑی عجیب تھی کہ میں ماں کو بھی نہ بلاؤں اور خاموشی سے نکاح ہو جائے، لیکن اس سے میری یہ خواہش پوری ہو رہی تھی کہ بیکار رسموں پر پیسہ برباد نہیں ہونا چاہیئے۔ پھوپھی نے ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ مجھ جیسا سیدھا آدمی سوائے ہاں کے کچھ کہہ ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے ہاں کہہ دی۔ پھوپھی نے سکون کا سانس لیا لیکن اُس کی تکلیف کم نہیں ہو رہی تھی۔ آدھی رات کے وقت اُسے نیند آنے لگی۔ یہ شاید انجکشن کا اثر تھا جو ڈاکٹر لگا گیا تھا۔ اس کی جب آنکھیں بند ہوئیں تو میں اسے کچھ اور ہی سمجھا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ ٹھیک چل رہی تھی۔ اُس کی بیٹی بھی میرے ساتھ اُس کے پاس بہت دیر بیٹھی رہی۔ جب یقین ہو گیا کہ یہ نیند ہے تو میں نے اُس کی بیٹی سے کہا کہ وہ اسی کمرے میں سو جائے اور خدانہ کرے، ضرورت پڑے تو مجھے بُلا لے۔ میری چارپائی ساتھ والے کمرے میں بچھائی گئی تھی۔ میں اُس کمرے میں چلا گیا اور

لیٹ گیا۔

نیند نہیں آ رہی تھی۔ دل پر ڈر بھی تھا اور گھبراہٹ بھی۔ کبھی خیال آتا کہ میں اپنی پھوپھی کے لئے قربانی دے رہا ہوں جس سے میرے والد مرحوم کی رُوح بھی خوش ہو جائے گی۔ اس خیال سے مجھے دِلی سکون ملتا، مگر ماں کا خیال آتے ہی میں تذبذب میں پڑ جاتا۔ معلوم نہیں اُس نے میری شادی کے کیا کیا پروگرام بنا رکھے تھے۔ میں اُس کی غیر حاضری میں شادی کر رہا تھا۔ ایسے ہی متضاد خیال آتے اور مجھے خوش بھی کرتے رہے پریشان بھی۔ اسی کش مکش میں میری آنکھ لگ گئی۔

مجھے پھوپھی کی بیٹی نے جگایا۔ صبح ہو گئی تھی۔ میں گھبرا کر اُٹھا اور اپنی پھوپھی زاد سے پوچھا کہ پھوپھی کیسی ہے؟ اُس نے بتایا کہ معمولی سا افاقہ ہے۔

"آپ نے میری ماں کو بچا لیا ہے" — پھوپھی زاد کہنے لگی — "میں آپ کی یہ قربانی ساری عمر نہیں بھولوں گی۔ میں آپ کے پاؤں دھو دھو کر پیتوں گی" — پھر قدرے شرما کر بولی — "امّی نے ابّا جان سے کہہ دیا ہے کہ دس گیارہ بجے مولوی کو اور دو تین آدمیوں کو بُلا لائیں۔ آپ نہا دھو لیں۔ آپ کے پاس کپڑوں کا دوسرا جوڑا ہے وہ پہن لیں۔"

ایک عجیب سا خوف تھا جو میرے دل پر سوار تھا۔ میں نے پھوپھی کی بات مان تو لی تھی لیکن میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ میرا یہ اقدام صحیح ہے یا غلط۔ میں جب پھوپھی کے کمرے میں گیا تو میں نے اُس کی رات والی حالت میں کوئی اچھی تبدیلی نہ دیکھی۔ ڈاکٹر کو پھوپھا لے آئے تھے۔ اُس نے کوئی امید افزا بات نہ کی۔ دوائی دے دی اور ساتھ یہ مشورہ بھی دیا کہ لاہور میو ہسپتال میں لے جاؤ لیکن یہ بھی کہا کہ اس حالت میں لے جانا خطرناک ہے۔ پھوپھی کو اپنی موت کا غم نہیں تھا۔ وہ اس انتظار میں تھی کہ اس کی بیٹی کی شادی میرے ساتھ ہو جائے۔

گیارہ بجے کے قریب مولوی اور محلّے کے چار آدمی آ گئے۔ اندر محلّے کی چند ایک لڑکیاں اور عورتیں آ گئی تھیں جو پھوپھی کی بیٹی کو دُلہن بنا رہی

تھیں۔ مردوں کو میرے پھوپھا نے پھوپھی کی حالت اور خواہش بتا کر کہا کہ اس کی خاطر بیٹی کی شادی جلدی میں اور خاموشی سے کی جا رہی ہے۔ عورتوں کو بھی یہی بتایا گیا تھا۔ مردوں نے پھوپھا کی بات پسند کی اور تعریف بھی کی۔ مولوی نے میرا نکاح پڑھ ڈالا۔ اندر سے بھی گواہ ایجاب و قبول کرا لائے — اور میں شادی شُدہ لوگوں کی فہرست میں آ گیا۔

مولوی اور اس کے ساتھ آئے ہُوئے آدمیوں کی تواضع چائے اور مٹھائی سے کی گئی۔ عورتوں کے لئے بھی یہی انتظام تھا۔ سب لوگ چلے گئے تو میں اپنی دُلہن کے ساتھ پھوپھی کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور وہ اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے ہم دولہا دُلہن کی بلائیں لیں، میرا سر چُوما اور اپنی بیٹی کو گلے لگایا۔ میں نے دیکھا کہ پھوپھی کے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔ اُس کی آنکھیں اب مریضوں کی طرح اَدھ کھلی نہیں تھیں۔ اُس میں یہ تبدیلی دیکھی اور مجھے خوشی ہوئی۔ میں نے وہ دن وہیں گزارا۔ رات بھی وہیں گزری۔ رات تک پھوپھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کی آواز مریضوں والی نہ رہی۔ گھر میں عورتیں آتی رہیں اور وہ انہیں بتاتی رہی کہ بیٹی کا جہیز اس کے ذمّے قرض ہے۔ جو چیزیں اور زیورات تیار ہیں وہ ساتھ بھیج رہی ہے۔

میں دوسرے دن اپنی دُلہن کو ساتھ لے کر رخصت ہُوا۔ دُلہن کا ایک ٹرنک تھا جس میں اُس کے کپڑے اور زیورات تھے۔ پھوپھی نے مجھے کہا کہ وہ بہت جلدی جہیز تیار کر کے بھیج دے گی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ جہیز کا خیال دل سے نکال دیں لیکن وہ نہ مانی کہنے لگی کہ مجھے بیٹی کی شادی کی خوشی کے ساتھ ہمیشہ یہ افسوس رہے گا کہ میں اپنے ارمان پورے نہ کر سکی۔ میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اب تو خوشی سے چلنے پھرنے لگی ہوں، معلوم نہیں دل کا یہ دَورہ کب مجھے قبر میں لے جائے۔

مَیں جب اپنے گھر میں داخل ہُوا تو آگے آگے میں تھا۔ ماں مجھے دیکھ کر میری طرف دوڑی۔ خوشی سے اُس کا چہرہ دمک اُٹھا مگر میرے پیچھے جب میری دُلہن داخل ہوئی تو ماں جہاں تک پہنچی تھی وہیں رُک گئی۔ دُلہن کے پیچھے قُلی اندر

آیا جس کے سر پر بڑا اسا ٹرنک تھا۔ میری دُلہن نے آگے بڑھ کر میری ماں کے پاؤں چھوئے۔ ماں ابھی تک یہ سمجھ رہی تھی کہ یہ لڑکی مہمان ہے۔ میں نے قُلی کو پیسے دے کر فارغ کر دیا۔ ماں سنبھل گئی۔ اُس نے دُلہن کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ظاہر داری کے طور پر کہا — "آؤ بیٹی۔ تم کیسے راستہ بھول کے اِدھر آنکلی ہو؟"

کمرے میں جا بیٹھے تو مَیں نے ماں سے کہا کہ یہ راستہ بھول کر نہیں آئی، دُلہن بن کر آئی ہے۔ کل ہماری شادی ہو گئی ہے۔ ماں پر اس کا یہ اثر ہُوا کہ مجھے دیکھ کر اُس کے چہرے پر جو رونق آئی تھی وہ بُجھ گئی۔ چہرہ زرد ہو گیا۔ آنکھیں ٹھہر گئیں۔ ہونٹ کُھل گئے اور مجھے یہ فکر ہونے لگا کہ ماں پر پھوپھی والا دَورہ پڑ گیا ہے۔ اُسے چُپ لگ گئی۔ یہ کیفیت سکتے والی تھی۔ مَیں کچھ گھبرایا لیکن میں خاموش نہ ہُوا۔ ماں کو بتاتا چلا گیا کہ یہ شادی کس طرح ہوئی ہے۔ میں نے اپنی رضامندی اور خوشی کا بھی اظہار کیا۔ اُسے پھوپھی کے اچانک دل کے دَورے کی پوری بات سنائی اور پھوپھی نے جو باتیں کی تھیں وہ بھی سنائیں۔

"اگر تم میرے بیٹے ہو تو ابھی اس کُتی کو گاڑی پر بٹھا کر گھر بھیج دو" — میری ماں بم کی طرح پھٹ پڑی — "اُس (پھوپھی) کے دل کو دَورے کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ مری کیوں نہیں؟ نکاح پڑھا کر وہ اُٹھ کیوں بیٹھی تھی؟ جوانی میں اُسے دل کے دَورے زیادہ پڑتے تھے۔ لوگ اُسے بھی جانتے ہیں اور اُس کے خاوند کو بھی۔ اس عورت کی جوانی نئے سے نئے ڈاکٹروں، ہٹے کٹے حکیموں اور پیروں عاملوں کے پاس گزری ہے۔ اپنے خاوند کو یہ اندھا کر کے اُسے اُنگلیوں پر نچاتی رہی ہے۔ اُس کا خاوند مرد نہیں گائے ہے۔ بیوی نے جہاں باندھ دیا وہیں ڈھیر ہو گیا"۔ ماں نے میری دُلہن کی طرف بازو لمبا کر کے اُنگلی کا اشارہ کیا اور دانت پیس کر بولی — "اور یہ لڑکی معلوم نہیں کس ڈاکٹر، حکیم یا کون سے پیر کی اولاد ہے۔"

پہلے ماں پر سکتے والی خاموشی طاری تھی۔ وہ بولی تو مجھے چُپ لگ گئی۔ مجھے زیادہ حیرت اس پر تھی کہ میری ماں اتنے زیادہ غصّے بلکہ عتاب میں بول رہی تھی۔ اسے تو ویسی ہی سیدھی اور بُدھو عورت سمجھتا تھا جیسا میں تھا۔

اس کا چہرہ جو زرد ہو گیا تھا، غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ مجھے بھی غصّہ آنا چاہیے تھا لیکن غصّہ نہ آیا۔ میں تو کچھ سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ماں کے مُنہ میں جو آیا وہ کہتی چلی جا رہی تھی۔ میری دُلہن کے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے اُس کے آنسو دیکھے تو اُسے دوسرے کمرے میں بھیج دیا، پھر ماں سے کہا کہ جو کچھ بھی ہُوا ہے اس میں یہ لڑکی بے قصور ہے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اگر پھوپھی نے مجھے دھوکہ دیا ہے تو یہ میری بھی غلطی ہے کہ میں جذبات میں آکر دھوکے میں آگیا۔ اب مجھے اور زیادہ پاگل نہ بناؤ، مجھے بتاؤ کہ یہ قصّہ کیا ہے۔

ماں میری فطرت کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اُسے مجھ پر رحم آگیا اور وہ آرام آرام سے مجھے بتانے لگی کہ پھوپھی نے مجھے کس طرح دھوکا دیا ہے۔ مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ میری ماں دُنیا کو خوب سمجھتی ہے۔ اُس نے مجھے بتایا کہ میرے والد مرحوم نے میری پھوپھی کو اُس کی کرتوت کی وجہ سے دُھتکار رکھا تھا۔ اس کی شادی جس آدمی کے ساتھ ہوئی اس میں معلوم نہیں کیسی کیسی کمزوریاں تھیں۔ میری پھوپھی خوبصورت بھی تھی اور آوارگی کی حد تک ہنسنے کھیلنے والی بھی۔ اس کی شادی جلدی کر دی گئی تھی کیونکہ اس کے چال چلن کے متعلق لوگ باتیں کرنے لگے تھے۔ خاوند اس کے مطلب کا نہیں تھا۔ پھر ہم یہی سُننے لگے کہ وہ بیمار رہتی ہے۔ سُسرال میں ہو یا میکے، وہ ڈاکٹروں اور حکیموں کے پاس جاتی اور پھر وہ پیروں کے پاس جانے لگی۔ کوئی بات چھُپی نہیں رہ سکتی۔ سب کو پتہ چل گیا کہ وہ ڈاکٹروں اور حکیموں کے پاس جا کر بلاوجہ معائنے کراتی رہتی اور کوشش کرتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ وقت انہی کے پاس گزارے۔

اس طرح وہ بدنام ہو گئی۔ صرف خاوند تھا جو شاید شرافت کی وجہ سے چُپ تھا یا وہ واقعی اسے بیمار سمجھتا تھا۔ وہ اس کا مرید اور غلام بنا رہا۔ پھوپھی اتنی ہنس مُکھ اور زبان کی اتنی میٹھی تھی کہ اس کے اخلاق کو جاننے والے بھی اسے پسند کرتے تھے اور اس کی باتوں میں آجاتے تھے۔ اس کا دل کا مرض اتنا مشہور تھا کہ ڈاکٹر اور حکیم یہ جانتے ہوتے کہ اسے کوئی مرض نہیں، اسے کہتے تھے کہ ہاں تمہیں دل کا مرض ہے۔ ماں نے مجھے بتایا کہ جس ڈاکٹر کے متعلق تم کہتے ہو کہ اسے

دیکھنے آیا تھا اس کے ساتھ تو تمہاری پھوپھی کی دوستی بڑی پرانی اور گہری ہے۔ اس نے تمہارے پھوپھا کو یقین دلا رکھا ہے کہ تمہاری پھوپھی دل کی مریضہ ہے اور اسے ہمیشہ سکون میں رکھا کرو۔ اسی کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔

ماں نے بتایا کہ میرے والد مرحوم نے اس کے ساتھ بول چال بند کر رکھی تھی۔ اس نے میری دادی پر اپنا جادو چلا رکھا تھا اور اسے اس لئے اپنے پاس رکھا ہوا تھا کہ دادی کے ہاتھ میں کچھ رقم اور زیورات تھے۔ تھوڑی سی زمین بھی تھی جو دادی کے نام تھی۔ پھوپھی نے یہ زمین فروخت کرا کے یہ رقم بھی اپنے پاس رکھ لی تھی۔ یہ جو اُس نے دادی کا چہلم اتنی شان و شوکت سے کیا تھا یہ دادی کی رقم میں سے کیا تھا اور یہ دراصل اس خوشی کی دعوت تھی کہ دادی مر گئی ہے۔

"یہ مجھ سے بھول ہوئی کہ اس عورت کے متعلق تمہیں یہ باتیں پہلے نہ بتائیں" ——ماں نے کہا —"ایک تو یہ میری عادت نہیں، دوسری وجہ یہ تھی کہ میں تمہارا دماغ خراب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ تمہاری شادی کروں گی۔ ماں نے اسے بھی اپنے جیسا بنا رکھا ہوگا۔ اگر ماں نے نہیں بتایا تو اس پر ماں کا اثر ضرور ہوگا۔ یہ تم سے ساڑھے تین سال بڑی ہے .... چہلم کے بعد تمہاری پھوپھی نے آنسو بہا کر تمہیں وہاں روک لیا تو میں سمجھ گئی تھی کہ یہ تم پر اپنا جادو چلانا چاہتی ہے، اور تمہیں یہی کہے گی کہ تم اس کی بیٹی کا رشتہ قبول کر لو۔ یہ تو میرے گمان میں بھی نہیں آیا تھا کہ اپنی بیٹی کے ساتھ تمہارا نکاح پڑھا کر تمہارے ساتھ رخصت کر دے گی۔ میں نے گاڑی میں بیٹھ کر تمہیں خبردار کیا تھا کہ یہ عورت بہت چالاک ہے، اس سے بچ کے رہنا۔ گاڑی چل پڑی تو میں نے جلدی جلدی سے تمہیں کہا کہ یہ تمہیں اپنی بیٹی دینا چاہتی ہے۔ تم شاید میری پوری بات نہیں سن سکے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ میں اس کی یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہونے دوں گی۔"

"لیکن پھوپھی نے تو کہا تھا کہ آپ اُسے کہہ چکی ہیں کہ شفقت تمہارا بیٹا ہے"——میں نے ماں سے کہا —"اور وہ یہ بھی کہتی تھی کہ والد مرحوم نے مجھے اس کی گودی میں ڈالا تھا۔"

"سب جھوٹ ہے"——ماں نے جواب دیا ——"تمہاری پیدائش کے بعد وہ اُس وقت ہمارے گھر آئی تھی جب تمہارے ابا فوت ہوئے تھے۔ مرحوم نے تو اپنے گھر میں اس کا داخلہ بند کر رکھا تھا۔ میں نے تمہارے ابا کی روح کو راضی رکھنے کے لئے تمہاری پھوپھی کو اُن کی وفات کی اطلاع ہی نہیں دی تھی۔ وہاں دو اور گھروں کو تار دیتے تو تمہاری پھوپھی کو بھی پتہ چل گیا اور وہ آگئی۔ تمہارے ابا دفن ہو گئے تو اس عورت نے ہمارے محلے کی عورتوں کو سنانے کے لئے مجھے کوسنا شروع کر دیا کہ میں نے اُسے اُس کے بھائی کے مرنے پر نہیں بلایا۔ میں اُس روز خود جلی بیٹھی تھی۔ تمہارے ابا مجھے جوانی میں تنہا چھوڑ گئے تھے۔ اس عورت نے بکواس شروع کی تو میں اسی طرح پھٹ کر بولی جس طرح آج اُس پڑا تھا۔ وہ صاف بیمار نظر آتی تھی۔ بہرحال میں ایک ایسے بھنور میں پھنس گیا جس سے نکلنا مجھے ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ ماں کے یہ الفاظ میرے دل میں تیر کی طرح اُتر گئے کہ میں سمجھوں گی کہ بڑھاپے میں میرا بیٹا مر گیا ہے۔ دُلہن کو میں گھر سے نکال نہیں سکتا تھا اور پھوپھی کو میں ایسا فریبی نہیں سمجھتا تھا جیسا ماں نے بتایا تھا۔

ماں محلے کے گھر گھر پھری اور بتایا کہ میری پھوپھی نے مجھے پھانس لیا ہے۔ رات کو دُلہن سے بات ہوئی۔ وہ دوسرے کمرے میں میری ماں کی ساری باتیں سُنتی رہی تھی۔ اُس نے رات تک میری ماں کا احتجاج اور رویّہ بھی دیکھ لیا تھا، اور اُس نے میری ماں کا فیصلہ بھی سُن لیا تھا۔ میں جب رات کی تنہائی میں اُس کے پاس بیٹھا تو اُس نے مجھ سے پوچھا ——"آپ کا فیصلہ کیا ہے؟ آپ ماں کو ناراض کر کے مجھے اپنے گھر میں بسائیں گے؟"

"میں اپنی ماں کو ناراض نہیں کروں گا"——میں نے اُسے کہا ——"مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ تمہاری ماں نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے یا اُسے واقعی دل کا دورہ پڑا تھا۔"

"اگر میں آپ کو سچ بتا دوں تو آپ اپنی ماں سے کہیں گے کہ مجھے قبول کر لے"؟——اُس نے کہا ——"میں آپ کی بیوی بن چکی ہوں۔ اگر آپ نے مجھے میرے

گھر بٹھا دیا اور مقدمہ بازی شروع کر دی تو میری ساری عمر خاوند کے بغیر گزرے گی۔ کیا آپ مجھے ایسے قصور کی سزا دیں گے جو میرا نہیں؟"

میں اسی پر حیران ہو گیا کہ اس لڑکی کو یہ بھی معلوم تھا کہ مقدمہ بازی بھی ہوگی۔ میں نے یہ پہلو سوچا ہی نہیں تھا لیکن میں یہ دیکھ رہا تھا کہ وہ مجھے دھمکی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے ماں کی بیٹی کے سامنے بولی تھی۔ میں نے اُسے اتنی سنائیں اور ایسی سنائیں جیسے اُس کے کپڑے اُتار کر اُسے ننگا کر دیا ہو۔ میں نے اُسے کہا کہ تمہارے بھائی نے اس گھر کا دروازہ تمہارے لئے بند کر رکھا تھا۔ اُس کی میّت پر تمہیں بلا کر میں اُس کی رُوح کو تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی۔ اُس وقت اور آج کے دن کے درمیان اتنے سال گزر گئے ہیں جتنی تمہاری عمر ہے، میں نہیں بولی۔ تمہاری پھوپھی کبھی کبھار آتی رہی اور میں نے ظاہر داری اور دنیا داری قائم رکھی.... تمہارے ابا نے کبھی اس عورت کا نام لینا بھی گوارا نہیں کیا تھا، وہ ایسی خواہش کیوں کرتے کہ تمہاری شادی اس کی بیٹی کے ساتھ ہو۔"

میں نے ماں سے کہا کہ میں اب کیا کر سکتا ہوں، گواہوں کے سامنے مولوی نے نکاح پڑھا ہے۔ مجھ سے نکاح نامے پر دستخط کرائے گئے ہیں۔ میں اس لڑکی کو گھر سے کس طرح نکال سکتا ہوں۔ ماں نے صاف کہہ دیا — "میں اس لڑکی کو اس گھر میں نہیں رہنے دوں گی۔ اگر تم اسے اپنی بیوی سمجھتے ہو تو اسے اپنے ساتھ لاہور لے جاؤ۔ جوانی میں خاوند مر گیا تھا، بڑھاپے میں سمجھوں گی بیٹا مر گیا ہے۔"

ماں اُٹھی اور باہر نکل گئی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میری ماں نے پھوپھی کے متعلق جو کچھ مجھے بتایا ہے وہ سب جھوٹ ہے مگر میں یہ بھی ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ پھوپھی اتنی زیادہ خراب اور مکّار عورت ہے جتنی میری ماں بتا رہی تھی۔ ماں کا احتجاج قابلِ فہم تھا۔ اس نے معلوم نہیں میری شادی کے کیا کیا پروگرام بنا رکھے تھے۔ میں یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اُس رات پھوپھی کو دل کا دَورہ نہیں دے رہی تھی بلکہ اس ڈر سے اُس کے آنسو نکل آتے تھے کہ میں نے اُسے گھر میں نہ رکھا تو اُس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ مجھے سچ

سچ بتا دے کہ اُس کی ماں نے یہ کیا ڈرامہ کھیلا ہے۔

"آپ کی ماں ٹھیک کہتی ہے کہ میری ماں کو دل کی تکلیف نہیں" — اُس نے کہا — "میرے ابا بالکل ڈھیلے ڈھالے اور کام کاج اور ذمّہ داریوں سے بھاگنے والے آدمی ہیں۔ ڈاکٹروں وغیرہ کے پاس جانا میری ماں کی عادت ہے.... آپ جب کالج میں پڑھتے تھے تو ایک روز میں نے اپنی ماں سے کہا کہ میرا رشتہ آپ کے ساتھ کریں۔ ماں نے کہا کہ اس کی ماں کے پاس ہے ہی کیا؟ ابھی یہ بھی معلوم نہیں کہ لڑکا پڑھ کر کیسی نوکری میں لگے گا۔ اس لڑکے کی ماں مجھے ویسے بھی اچھی نہیں لگتی۔ اگر لڑکا پڑھ کر اچھی تنخواہ پر لگ گیا تو میں اسے پھانس لوں گی۔ اس دوران میری ماں میرے لئے لڑکے دیکھتی رہی۔ اس نے تین گھروں میں کہلوایا۔ تینوں نے جواب دے دیا۔ وہ میری ماں کی بُری شہرت کی وجہ سے مجھے قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ تینوں گھروں سے جواب ملا — 'جیسی ماں تھی ویسی بیٹی ہو گی'....

"ماں مایوس ہو گئی۔ اس سے زیادہ میں مایوس تھی جس کے مستقبل کا سوال تھا.... پھر آپ ملازم ہو گئے۔ میری ماں آپ کے گھر مبارک دینے گئی اور معلوم کر لیا کہ آپ کی تنخواہ کتنی ہے۔ واپس آئی تو اُس نے مجھے بتایا کہ لڑکے کی تنخواہ اچھی ہے اور عہدہ بھی ہے لیکن آپ کی ماں سے رشتے کی بات ہوتی تو اُس نے صاف جواب دے دیا۔ آپ کی ماں نے میری ماں سے یہ بھی کہا تھا کہ میں اپنے خاوند کی رُوح کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتی .... میری ماں نے اپنے مُنہ پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ میں تمہاری شادی اسی لڑکے کے ساتھ کراؤں گی۔ وہ کبھی کبھی آپ کے گھر جایا کرتی تھی۔ خدا نے یہ موقع پیدا کر دیا کہ نانی (میری دادی) مر گئی۔ جہلم پر آپ کو بلانے کے لئے میری ماں نے آپ کو خط لکھوایا اور آپ اپنی ماں کے ساتھ آ گئے۔ میری ماں کو یہ توقع تھی کہ آپ اکیلے آئیں گے۔ وہ آپ کے ساتھ ماں کو دیکھ کر پریشان ہو گئی....

"میری ماں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ آپ کے ابا مرحوم کو یاد کر کے اپنے آنسو نکالے اور آپ کو روکنے کے لئے ایسی جذباتی باتیں کیں کہ آپ رُک گئے

اور آپ کی ماں چلی گئی۔ میری ماں نے مجھے بتایا کہ وہ رات کو دل کے دَورے کا بہانہ کرے گی اور آپ کو جذبات میں لا کر بچالے گی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ ایسا نہ کرے۔ ایسے ڈھونگ کامیاب نہیں ہُوا کرتے۔ اُس نے کہا کہ لڑکا بالکل بُدھو ہے اور میرے ساتھ اُسے بہت پیار ہے۔ وہ بات میں آجائے گا۔ میں نے اُسے پھر بھی روکا۔ اُس نے کہا ـــ 'میں نے مردوں کو نچا دیا ہے، یہ تو میرے سامنے دودھ پیتا بچّہ ہے' ـــ رات کو اُس نے دِل کے دَورے کا بہانہ بنایا۔ آپ پر اس کا اُس سے زیادہ اثر ہُوا جتنا وہ سمجھتی تھی کہ ہو گا۔ اُس نے جو باتیں کر کے آپ کو شیشے میں اُتار لیا وہ سُن کر میرے بھی آنسو نکل آتے تھے۔ مجھے بھی یقین ہونے لگا کہ اسے واقعی دل کا دورہ پڑا ہے اور یہ زندہ نہیں رہے گی.....

"آپ اُس کی بات مان کر سونے کے لئے چلے گئے تو میں نے گھبرا کر ماں سے پوچھا کہ امّی ٹھیک تو ہو؟ وہ ہنس پڑی۔ کہنے لگی ـــ 'دیکھا؟ تم بھی یہ داؤ سیکھ لو۔ اب اُس کے کمرے میں جاؤ اور اُسے رو کر کہو کہ میری امّی کو مرنے سے بچالو' ـــ میں نے اُسے کہا کہ نہیں، جوان آدمی ہے، میں اُس کے کمرے میں نہیں جاؤں گی۔ ماں نے کہا کہ وہ تجھے کھا نہیں جائے گا۔ اُس نے چھیڑ چھاڑ کی تو بھاگ نہ آنا۔ اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کرو۔ جاؤ، کوئی حرج نہیں۔ کل میں اسے تمہارا خاوند بنا دُوں گی.... میں نے ماں سے یہ بھی کہا تھا کہ آپ کی ماں کو بلا لے۔ اس نے جواب دیا کہ اس کی ماں کبھی نہیں مانے گی۔ نکاح ہو گیا تو اس ماں کا باپ بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ میں آپ کے کمرے میں گئی اور میری ماں نے جو ڈھونگ رچایا تھا اس میں مَیں بھی شریک ہو گئی.... میں نے آپ سے کچھ بھی نہیں چُھپایا۔ اب آپ کی مرضی ہے کہ مجھے بسالیں یا دھتکار دیں۔ میں آپ کی بیوی ہوں۔ پوری وفاداری کروں گی۔"

مجھے چکر آرہے تھے۔ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ ایک عورت اس قسم کی اداکاری کر سکتی ہے۔ مجھے غصّہ آنے لگا لیکن پھوپھی کی بیٹی پر رحم بھی آنے لگا۔ میں اُسی وقت اس کمرے سے نکل کر ماں کے پاس جا بیٹھا اور اُسے اپنی دُلہن کی سنائی ہوئی ساری بات سُنا دی۔ ماں نے کہا کہ اب بھی اس لڑکی کو

بیوی بنا کر رکھو گے جو اپنی ماں کے ڈھونگ میں شریک تھی اور رات کو تنہائی میں تمہارے کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہ کبھی تمہاری وفادار نہیں رہ سکتی۔ وفا میں نے کی ہے۔ تمہارے ابّا جوانی میں فوت ہوتے تو میں نے دل میں قسم کھائی تھی کہ اس شخص کے بچّے کو سوتیلے باپ کے حوالے نہیں کروں گی۔ میں نے جوانی اپنی قسم میں گال دی، حالانکہ تمہارے ابّا نے میرے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔

رواج کے مطابق دوسرے دن مجھے دُلہن کو اس کے گھر لے جانا تھا۔ میں رات اس کے کمرے میں نہ گیا۔ ماں کے کمرے میں سو یا۔ اُس کے ساتھ جو ٹرنک آیا تھا وہ نہ ماں نے کھول کر دیکھا نہ میں نے۔ یہ ٹرنک اگلی صبح اسی طرح اٹھوا کر میں نے دُلہن کو ساتھ لیا۔ گاڑی میں بیٹھا اور اُسے گھر لے گیا۔ پھوپھی ہشاش بشاش تھی۔ ہشاش بشاش تو وہ نکاح کے فوراً بعد ہو گئی اور دل کا دَورہ ختم ہو گیا تھا۔ ماں نے مجھے بتا دیا تھا کہ پھوپھی کے گھر جا کر مجھے کیا کرنا ہے۔ میں نے ویسے ہی کیا۔ وہاں پہنچتے ہی پھوپھی سے کہا کہ میں صرف رسم پوری کرنے آیا ہوں۔ کل صبح لاہور پہنچنا ہے۔ میں ایک منٹ کے لئے بھی نہیں رُک سکتا۔ جاتے ہی کوارٹر یا کرائے کے مکان کا بندوبست کر لوُں گا اور اسے لے جاؤں گا۔ ماں کے ساتھ میری لڑائی ہو گئی ہے اسے وہاں نہ بھیجنا۔ میں اسے لاہور اپنے ساتھ رکھوں گا۔

پھوپھی کو میں نے بولنے کی مہلت نہ دی اور اُلٹے پاؤں وہاں سے بھاگ آیا۔ گاڑی کا کوئی وقت نہیں تھا۔ بسوں کے اڈے پر گیا اور بس سے اپنے گھر آگیا۔ اگر ماں مجھے یہ ہدایتیں نہ دیتی تو میں پھوپھی کی باتوں میں آجاتا۔ میں اتنا چالاک کہاں تھا۔ میں نے پھر بھی ماں کو راضی کرنے کی کوشش کی اور اسے کہا کہ پھوپھی مقدمہ کر دے گی مگر ماں کا رویہ بڑا ہی سخت تھا۔

میں اپنی نوکری پر چلا گیا اور اپنے ساتھیوں کو ساری واردات سُنائی۔ میں نے انہیں کہا کہ مجھے اب بھی یقین نہیں آتا کہ کوئی عورت اتنی چالاک ہو سکتی ہے۔ میرے ایک بوڑھے ساتھی نے کہا کہ تم میاں! دُنیا کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہاری پھوپھی جیسی عورتوں کی ہمارے معاشرے میں کمی نہیں۔ بُدھو اور سیدھے سادے خاوندوں کی بیویوں میں سے ایسی بھی ہوتی ہیں جو خلوصِ نیت سے گھر کا کاروبار

اپنے ہاتھ میں لے کر خاوند کی عزت قائم رکھتی ہیں، اور ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں
اپنے خاوندوں سے دلی لگاؤ نہیں ہوتی۔ وہ کسی نہ کسی بیماری کا بہانہ کر کے
ڈاکٹروں اور حکیموں کے پاس جاتی رہتی ہیں۔ پیروں فقیروں سے دعائیں اور
تعویذ لینے کے بہانے ان کے حجروں میں وقت گزارتی ہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو
جا کر دیکھ لو۔ اس قسم کی عورتیں جن پیروں کی مرید بنتی ہیں وہ خوبرو اور ہٹے
کٹے ہوتے ہیں۔ ایسی عورتیں خاوندوں کو اپنا مرید بنائے رکھتی ہیں۔ یہ ہنس مکھ
ہوتی ہیں۔ ہر ڈھنگ جانتی ہیں۔ اپنے دشمن کو بھی آنسوؤں سے، جذباتی باتوں
سے اور زبان کی مٹھاس اور جھوٹ سے موم کر لیتی ہیں۔

مجھے اپنے ساتھی طرح طرح کے مشورے دینے لگے۔ ماں کے خط آتے
تھے۔ اس نے ایک وکیل کے ساتھ بات کر لی تھی۔ پھوپھی کی بیٹی کے بھی خط آتے
رہے۔ اس کے خط بڑے دردناک ہوتے تھے۔ میں پگھل جاتا تھا۔ وہ ہر خط میں
لکھتی تھی کہ مجھے لاہور بلا لو۔ میں نے اسے پہلا اور آخری خط لکھا جس میں یہ الفاظ
لکھے کہ یہ ڈرامہ دادی کے چہلم پر شروع ہوا تھا۔ اب دعا کرو کہ تمہاری ماں اور
میری ماں کے چہلم ذرا جلدی ہوں۔ چہلم سے جو بات شروع ہوئی تھی وہ چہلم پر ہی
ختم ہوگی، خواہ یہ چہلم میری ماں کا ہو۔

میں نے لاہور مکان لے کر اپنی ماں کو بلا لیا۔ اسے میری پھوپھی نے پریشان
کرنا شروع کر دیا تھا۔ تقریباً ایک سال گزر گیا۔ ایک روز میں دفتر سے چھٹی کر
کے گھر گیا تو یہ دیکھ کر چکر آگیا کہ پھوپھی اور پھوپھا میرے گھر بیٹھے تھے۔ انہوں
نے ہمارے قصبے کے ایک آدمی سے میرے گھر کا پتہ معلوم کر لیا تھا۔ وہ ایک بار
لاہور آیا تو میرے پاس ٹھہرا تھا۔ پھوپھی اور پھوپھا یہ دیکھنے آئے تھے کہ ان کی
بیٹی انہیں بتائے بغیر میرے پاس تو نہیں آگئی؟ میری ماں پھوپھی کی طبیعت
صاف کر چکی تھی۔

معلوم ہوا کہ ان کی بیٹی تین چار روز سے بمع زیورات اور کچھ رقم کے
لاپتہ ہے۔ پھوپھی اور پھوپھا چلے گئے۔ ہم ماں بیٹا اس کے بعد اپنے گھر گئے تو
پتہ چلا کہ پھوپھی کی بیٹی نے ایک آدمی کے ساتھ دوستانہ گانٹھ رکھا تھا۔ وہ لاپتہ

ہوگئی اور پتہ چلا کہ وہ آدمی بھی لاپتہ ہے۔ دو مہینے بعد یہ آدمی واپس آیا۔ اس
نے بتا دیا کہ لڑکی اس کے ساتھ گئی تھی اور وہ اسے پاکستان کے ایک بڑے
شہر میں چھوڑ آیا ہے۔ یہ خبر مجھے لاہور میں اس طرح ملی تھی کہ یہ آدمی خود ہی میرے
پاس آگیا۔ اس نے میرے ساتھ دوستانہ باتیں کیں اور مجھے بتایا کہ شادی کے
بعد اس لڑکی نے اس کے ساتھ راہ و رسم پیدا کی تھی۔ اس آدمی نے مجھے کہا کہ
میں طلاق لکھ دوں کیونکہ میں اسے اپنے گھر تو لا نہیں رہا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اسے طلاق لکھ دی۔ اس نے طلاق کی
تحریر لے کر مجھے بتایا کہ میری پھوپھی نے اس سے دو ہزار روپیہ وصول کر لیا
ہے اور کہا ہے کہ وہ اس کی بیٹی کے ساتھ شادی کر لے اور وہ پولیس تک
نہیں جائے گی۔ شادی شدہ عورت کو ورغلا کر لے جانا اور طلاق کے بغیر شادی
کرنا جرم ہے۔ بہرحال پھوپھی نے دو ہزار کا سودا مار لیا اور میرا مسئلہ کسی
کے چہلم کے بغیر ہی حل ہو گیا۔

میں اب اپنی ماں کی پسند کی بیوی کا خاوند ہوں جو ہر لحاظ سے نیک
اور سلیقہ شعار ہے، اور میں پھوپھا جیسا نکھٹو خاوند نہیں ہوں۔ پھوپھی نے میری
آنکھیں اور میرا دماغ کھول دیا ہے

عجیب کہانی

شادی کی عمر کو پہنچ کر لڑکا اور لڑکی رُومانی جذبات سے مغلوب ہو جاتے ہیں میں بھی شادی کو ایک جذباتی معاملہ سمجھتا تھا۔ میری آپ بیتی کے کردار بھی اِسی خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ شادی کا تعلّق صرف جذبات سے ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شادی اپنے ساتھ ایسے حقائق لاتی ہے جو جذبات کو کچل ڈالتے ہیں۔ ازدواجی زندگی سے لُطف وہی اُٹھا سکتا ہے جو اِن حقائق کو قبول کر لے اور ان حقائق کا حق ادا کرے۔ میں آپ کو وعظ نہیں سُناؤں گا۔ مجھ پر جو بیتی ہے وہ سُنا دیتا ہوں۔ نتائج اور سبق آپ خود اخذ کریں۔

آج جب کہ میری عمر ساٹھ سال کے قریب پہنچ گئی ہے اور میری بیوی کو فوت ہوئے تین سال گزر گئے ہیں، مجھے وہ وقت یاد آرہا ہے جب میں اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کی طرح نوجوان تھا۔ وہ زمانہ آج کی نسبت بہت مختلف تھا۔ ایسی آزادی کسی کو حاصل نہیں تھی جیسے آج کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مذہب اور اخلاق سے ہی آزاد ہو گئے ہیں۔ چار دیواری کی دُنیا میں اور کئی خرابیاں تھیں، بے حیائی کا یہ عالم نہیں تھا۔ پھر بھی انسانی فطرت اپنا آپ دکھاتی رہتی تھی۔

بعض روپے پیسے والے لوگ پردے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انہیں ہندو اور سکھ لڑکیوں کا یہ طریقہ پسند تھا کہ وہ بے پردہ پھرتی تھیں۔

مجھے لاہور میں ملازمت مل چکی تھی۔ اُس زمانے میں والدین کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی تھی کہ لڑکا دس جماعتیں پاس کر لے اور اسے ملازمت مل جائے۔ ملازمت اور پیسے کی کمی تھی۔ میں نے دس کی بجائے بارہ جماعتیں

پاس کر لی تھیں۔ والد صاحب کی کوششوں سے سفارشیں ایسی مل گئیں کہ لاہور صوبائی حکومت کے ایک دفتر میں کلرکی کی نوکری مل گئی اور میں اپنے قصبے کو خیر باد کہہ کر لاہور چلا گیا۔ ایک لاج میں ایک کمرہ کرائے پر مل گیا۔

ملازمت کے بعد شادی ضروری سمجھی جاتی تھی۔ انتخاب والدین کیا کرتے تھے لیکن میری اپنی ایک پسند تھی جو میں والدین کو بتانے سے ڈرتا تھا۔ یہ رواج آج بھی ہے کہ جس گھر میں دانے ہوں وہاں لڑکیوں کے رشتے بغیر مانگے آجاتے ہیں لڑکی کو اس گھر سے خواہ کتنی ہی نفرت کیوں نہ ہو۔ اُس زمانے میں جس لڑکے کے خاندان کی زمین جائداد ہوتی یا لڑکا سرکاری ملازم ہوتا اُسے رشتہ آسانی سے مل جاتا تھا۔ مجھے بھی رشتے ملتے رہے جو کسی نہ کسی وجہ سے قبول نہ کیے گئے۔ میری ایک بہن تھی۔ مجھ سے تین سال بڑی اور شادی شدہ تھی۔ بہنوں کو بھائیوں سے بہت پیار ہوتا ہے لیکن میری بہن مجھے دیکھ کر جیتی تھی۔ ایسے پیار کی مثال کم ہی ملتی ہوگی۔

میں نے اپنی بہن کو اپنی پسند بتادی اور منّت سماجت کی کہ اس کا رشتہ لو۔ اس لڑکی کے گھر پردے کا رواج نہیں تھا۔ ان کا مکان ہمارے مکان کی نسبت بہت بڑا اور اچھا تھا۔ اُن کی زمین بھی تھی جو انہوں نے بٹائی پر مزارعوں کو دے رکھی تھی۔ دو بھائی ملازم تھے۔ باپ ریلوے کے محکمے سے ریٹائر ہُوا تھا اِس لیے اُسے بہت پیسہ ملا تھا۔ یہ خاندان دراصل درمیانے طبقے کا تھا لیکن رہن سہن اور نمود و نمائش امیروں جیسی تھی۔ دو بہنیں تھیں۔ برقعے کے بغیر باہر نکلتیں۔ چادر اوڑھا کرتی تھیں۔ اخلاقی لحاظ سے اس خاندان کے خلاف کسی کو کوئی شکایت نہیں تھی۔ ایسے شریفوں کا خاندان کتنا زیادہ مناسب ہوگا۔ بدنامی عموماً عورتوں کی ہُوا کرتی ہے لیکن اس خاندان کی عورتیں بھی نیک نام تھیں۔ ان لوگوں میں شو بازی کی کچھ کچھ عادت تھی لیکن تکبّر اور غرور نہیں تھا۔

اس خاندان کے ساتھ ہمارے خاندان کے تعلّقات گہرے تھے۔ میری بڑی بہن وہاں زیادہ آتی جاتی تھی۔ میری بہن کو بھی میری پسند اچھی لگی لیکن رکاوٹیں یہ تھیں کہ لڑکی کے والدین کی پسند کے متعلق پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کیسا گھر اور لڑکا چاہتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں شادی لڑکی لڑکے کی نہیں دو خاندانوں کی شادی ہوتی ہے۔ شادی کا فیصلہ بزرگ کرتے اور اپنی اولاد کی ازدواجی زندگی پر چھائے رہتے ہیں۔ میرے لیے دوسری مشکل یہ تھی کہ میرے والد صاحب کو لڑکی اس لیے پسند نہیں تھی کہ پردہ نہیں کرتی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ان دونوں بہنوں کے خلاف کبھی کوئی بات نہیں سُنی لیکن یوں بے پردہ ہو کر گھومنے پھرنے سے کوئی نہ کوئی خرابی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ لڑکی بے حیا ہو جائے۔

مجھے والد صاحب کا یہ اعتراض وزن دار نہیں لگتا تھا چونکہ میں جوان تھا اس لیے میں جذبات کے زور پر سوچتا تھا۔ میری یہ دلیل بڑی وزن دار تھی کہ یہ لڑکی مجھے اچھی لگتی ہے۔ وہ خوبصورت تھی۔ اُس کے جسم کی ساخت میں اور چہرے کے ہر نقش میں خدا نے حُسن بھر دیا تھا۔ میری بہن نے میرا ساتھ دیا۔ اُس نے والد صاحب کو منا لیا اور وہ رشتہ مانگنے چلے گئے۔ مجھے لاہور اپنی بہن کا خط ملا کہ لڑکی والوں نے رشتہ دے دیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ منگنی کی ضرورت نہیں، شادی کا دن مقرر کر کے شادی کر دی جائے۔ میرے لیے یہ خبر ناقابلِ یقین تھی لیکن یقین آگیا اور میں اپنی ہونے والی دلہن کے تصوّروں میں گم رہنے لگا۔ وہ مجھے اصل سے زیادہ خوبصورت نظر آنے لگی۔ میرا دل کام میں نہیں لگتا تھا اور میں شادی کو ایک جذباتی معاملہ سمجھ کر کام کے دوران بھی اس لڑکی کے ساتھ دل ہی دل میں باتیں کرتا رہتا۔

شادی کے لیے میں نے پندرہ دنوں کی چھُٹی لی۔ بارات گئی اور میں اپنی پسند کی لڑکی کو اپنے گھر لے آیا۔ اب بھی مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ میں اتنی خوبصورت لڑکی کا خاوند بن گیا ہوں۔ رات کو میں جب اُس کمرے میں داخل ہُوا جس کا رُومانی ذکر اکثر افسانوں میں پڑھا اور فلموں میں دیکھا تھا تو دلہن کو اُسی طرح پلنگ پر گٹھڑی بنی بیٹھے دیکھا جس طرح پڑھا اور سُنا تھا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے اُس کا گھونگھٹ اُٹھایا۔ اُس کی نظر [illegible] جھکی ہوئی تھیں مگر اُس نے سر اُٹھا کر مجھے یوں دیکھا جیسے ہم کئی بار مل چکے ہوں [illegible] کے پاس بیٹھ گیا۔

"آپ مجھے ا[illegible] بیوی سمجھ سکتے ہیں"۔۔۔ اُس نے کہا "لیکن میں آپ کو خاوند تسلیم نہیں کرتی"۔۔۔ اُس نے یہ چند ایک الفاظ ایسے لہجے میں کہہ

ڈالے جس میں غصہ نہیں تھا، طنز نہیں تھی، احتجاج بھی نہیں تھا۔ وہ تو جیسے مجھے کسی کا پیغام دے رہی تھی یا کوئی معمولی سی اطلاع۔

ایک سیکنڈ میں کئی خیال پستول کی گولیوں کی طرح میرے دل سے پار ہو گئے۔ اِس نے شاید کچھ اور کہا ہے جو میں سمجھ نہیں سکا.... اگر یہی کہا ہے تو مذاق کیا ہے۔ لڑکی زندہ دل معلوم ہوتی ہے .... اُس نے شاید کچھ بھی نہیں کہا، میرے کان بج رہے ہیں۔

مجھے خاموش دیکھ کر اُس نے کہا۔ ”یہ نہ سمجھیں کہ میں دل میں آپ کے لیے نفرت لے کر آئی ہوں، لیکن میرے دل میں آپ کی محبت پیدا نہیں ہو سکے گی۔ میں آپ کو بے قصور سمجھتی ہوں۔ آپ نے مجھے اغوا نہیں کیا۔ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔“

میرے سارے جسم میں جیسے خون رُک گیا ہو سکتے کی کیفیت تھی۔ مجھے اپنے والد صاحب کی بات یاد آئی کہ بے پردہ گھومنے پھرنے والی لڑکیوں میں ضروری نہیں کہ بے حیائی پیدا ہو لیکن کوئی نہ کوئی خرابی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ میں اس لڑکی کے مُنہ سے ایسے الفاظ سننے کے لیے بالکل ہی تیار نہیں تھا۔ میری کیفیت شاید اُس بچے کی سی ہو گئی تھی جو دوڑا دوڑا ماں کے پاس اُس کی گود میں گر پڑنے کو جائے اور ماں اُس کے سینے میں خنجر اُتار دے۔

”تم کیا کہہ رہی ہو؟“ میں نے کانپتی اور ڈری ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے خاوند تسلیم کرنے سے انکار کرنا تھا تو شادی سے پہلے کیا ہوتا۔ نکاح کے فارم پر پہلے تم نے دستخط کیے تھے، اس کے بعد مجھ سے کرائے گئے تھے۔“

”وہ دستخط میرے نہیں“۔ اُس نے نرم سے لہجے میں جواب دیا۔ ”میں نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے باوجود شادی ہو گئی۔ میں نے آپ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ مجھے زبردستی آپ کے ساتھ بھیجا گیا تو آسمان سر پر اُٹھا لوں گی۔ چیخوں گی، چلاؤں گی کہ میں نے اس آدمی کو دُولہا قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اور یہ مجھے زبردستی لے جا رہے ہیں لیکن مجھے آپ کا اور آپ کے والد صاحب کا خیال آ گیا۔ آپ اتنی بڑی

بارات لائے تھے، میرے والدین نے ساری برادری اکٹھی کر رکھی تھی۔ چار پانچ سو آدمیوں میں آپ کو میرے بغیر واپس آنا پڑتا تو آپ کے والد صاحب کا ہارٹ فیل ہو جاتا۔ وہ بے گناہ مارے جاتے۔ میں نے آپ کی، آپ کے والد صاحب کی اور آپ کے خاندان کی عزّت رکھ لی اور یہ سوچ کر آ گئی کہ آپ کو بتا دوں گی کہ ہماری شادی نہیں ہوئی کیونکہ نکاح نامہ جعلی ہے۔“

میرا دماغ آہستہ آہستہ بیدار ہونے لگا لیکن زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ میرے ہونٹ اور حلق خشک ہو گئے تھے۔ میں بار بار ہونٹوں پر زبان پھیرتا اور تھوک نگلتا تھا۔

اُس نے پلنگ پر بیٹھے بیٹھے پیٹھ میری طرف کر دی اور دونوں ہاتھوں سے قمیض اُٹھا کر پیٹھ ننگی کر دی۔ اُس کی اتنی دلکش اور سفید پیٹھ پر جامنی رنگ کی تین لکیریں تھیں۔

”دیکھ لیں آپ بھی“۔ اُس نے رندھیائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”یہ میرے ابّا کی چھڑی کی لکیریں ہیں .... میں نے آپ کا رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں اِس سے پہلے تین پیغام ٹھکرا چکی تھی۔ میرے ماں باپ یہ سمجھتے رہے کہ میں شادی سے گھبرا رہی ہوں، مگر آپ کا رشتہ ٹھکراتے ہوئے میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ میں اپنی پسند کی شادی کروں گی۔ تب میرے والد صاحب اور بھائیوں کو ہوش آیا کہ میں اپنی پسند کے کسی لڑکے کی خاطر کوئی رشتہ قبول نہیں کر رہی۔ مجھے والد صاحب نے بہت پیٹا۔ چھڑی سے مجھے مارا۔“

”وہ کون ہے جس کی خاطر تم نے مردوں جیسی دلیری کی ہے؟“۔ میں نے پُوچھا۔

”یہ نہیں بتاؤں گی“۔ اُس نے جواب دیا۔ ”یہ تو میں نے اپنے ماں باپ اور اپنے بھائیوں کو بھی نہیں بتایا تھا۔“

پہلے مجھ پر سکتہ اور عجیب سا خوف طاری تھا، پھر اچانک مجھ پر کمتری کے احساس کا غلبہ ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس خوبصورت لڑکی نے مجھے یہ کہا ہو کہ تم بدصورت اور بزدل ہو، تم تو مرد ہی نہیں۔ مرد تو وہ ہے جسے میں چاہتی ہوں،

تم کیا ہو!

مجھے اپنی بدصورتی کا احساس ہو گیا۔ مرد کسی عورت کا ایسا وار سہہ نہیں سکتا۔ خودکشی اور قتل کے باعث اکثر عورت کے ایسے ہی وار ہُوا کرتے ہیں اور یہی وار جابر مرد کو بھی عورت کے قدموں میں بٹھا دیتا ہے۔ میری حالت کچھ عجیب سی ہُوئی۔ میں دلیری اور بُزدلی کے درمیان پھنس گیا۔ کبھی غصہ آتا اور کبھی طبیعت ہتھیار ڈال دینے پر اُتر آتی۔

"اگر میں تمہیں وہی محبت دوں تو قبول نہیں کرو گی؟"— میں نے پوچھا۔

"نہیں"— اُس نے جواب دیا— "میں مجبور ہوں۔"

"تم نے یہ نہیں سوچا کہ میں تمہیں زبردستی اپنی بیوی بنا سکتا ہوں"— میں نے کہا۔

"میں آپ سے لڑائی نہیں کروں گی"— اُس نے کہا— "صرف یہ بتا دیتی ہوں کہ آپ میرے جسم کو اپنی بیوی کا جسم سمجھ کر اپنا حق استعمال کریں گے تو آپ قرآن پاک کی توہین کے مرتکب ہوں گے۔ خدا آپ کا اتنا بڑا گناہ نہیں بخشے گا۔ یہ بھی سوچ لیں کہ میں نے آپ کو قبول نہیں کیا، زبان سے ہاں نہیں کی، دستخط نہیں کیے۔"

وہ مجھ پر آسیب کی طرح غالب آتی جا رہی تھی اور میں دبتا جا رہا تھا۔ اگر وہ غصّے اور طنز سے بات کرتی، مجھے چیلنج کرتی یا دھمکی دیتی تو میں بھڑک اُٹھتا اور جوابی حملہ کرتا، مگر اُس کا لب و لہجہ ایسا تھا جیسے میں نے اُسے پناہ میں لے رکھا ہو اور وہ مجھے اپنی داستانِ غم سُنا رہی ہو۔ اُس کے بولنے کے انداز میں پختگی اور خود اعتمادی تھی۔

"میں نے قرآن کی توہین کی بات کی ہے"— اُس نے کہا— "یہ بات اس طرح ہوئی تھی کہ میں جس کو دل سے قبول کر چکی ہوں، اُس کے ساتھ میں نے قرآنِ پاک پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی کہ کسی اور کو خاوند تسلیم نہیں کروں گی۔ اُس نے بھی میرے ہاتھ کے ساتھ اپنا ہاتھ قرآنِ پاک پر رکھا اور کہا تھا کہ وہ میرے سوا کسی اور سے شادی نہیں کرے گا۔ میرے جسم کو ناپاک کرنے والا قرآنِ پاک کو ناپاک کرے گا۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اُسے ملتی رہی ہو"— میں نے کہا— "میں کس طرح کہہ سکتا ہوں کہ تمہارا چال چلن ٹھیک ہے۔"

"آپ جو چاہیں کہہ لیں"— اُس نے کہا— "ہم نے قرآنِ پاک کی قسم پر اپنا چال چلن بھی ٹھیک رکھا ہے۔ میرا ضمیر اور میری رُوح گناہ سے پاک ہے.... میں آپ سے نہیں ڈرتی، میرے دل میں قرآن کا خوف ہے۔ اگر میں اپنا آپ آپ کے حوالے کر دوں تو مجھے خدا سزا دے گا۔ میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ مجھے آپ سے نفرت نہیں۔ میں نے آپ کو دھتکارا نہیں۔ قرآن پاک اور اللہ اور رسولؐ کا واسطہ دے رہی ہوں کہ خدا کے قہر سے خود بھی بچیں اور مجھے بھی بچائیں۔"

"کیا میں تمہیں طلاق دے دوں؟"— میں نے دبے دبے لہجے میں پُوچھا— "مجھے کوئی راستہ بتاؤ... تمہارے والد صاحب کو بتا دوں کہ تم نے میری بیوی بننے سے انکار کر دیا ہے؟"

"آپ سوچ لیں"— اُس نے جواب دیا— "میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں نے آپ کے خاندان کی عزّت رکھ لی ہے۔ مجھے خود پتہ نہیں چل رہا کہ کیا کروں۔ اگر آپ مجھے آزاد کر دیں گے تو میں گھر سے اُس کے ساتھ بھاگ جاؤں گی۔ اگر آپ مجھے رُسوا اور بدنام کرنے کی کوشش کریں گے تو زیادہ بدنامی آپ کی ہو گی۔ میں کہوں گی کہ آپ میرے قابل نہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ اس کے کتنے معنی نکلتے ہیں۔"

اُس رات کی ساری باتیں بہت لمبی ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ رات انہی باتوں میں گزر گئی۔ صبح کی اذان ہو رہی تھی تو اُس نے کہا— "اگر آپ نے قرآنِ پاک کی لاج رکھ لی تو یہ میرا عقیدہ ہے کہ خدا کا کلام آپ کی لاج رکھ لے گا۔"

اُس نے یہ الفاظ ایسے لہجے میں کہے جیسے پیر اور جوتشی مستقبل کی باتیں بتایا کرتے ہیں۔ میرا دماغ ماؤف ہُوا جا رہا تھا۔ کچھ سمجھ آتی تھی کہ ان حالات میں کیا کروں۔ اُس نے مجھے ایک معاہدے پر راضی کر لیا تھا۔ میری کمزوری اور بے بسی دیکھیں کہ میں اس معاہدے کا پابند ہو گیا۔ دوسرے دن ولیمہ ہُوا۔ میرے دوست

مجھ سے بغل گیر ہو ہو کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے اور مذاق بھی کرتے تھے۔ میں بناوٹی ہنسی ہنس ہنس کر اُن کے مذاق کا جواب دے رہا تھا۔ میرے جسم کے اندر کانٹے چبھ رہے تھے۔ کبھی تو مجھے غصّہ آجاتا اور کبھی میں بُجھ کے رہ جاتا۔ میری بیوی بھی شرم و حجاب کی اداکاری کرتی رہی۔

میں اُس کے ساتھ اُس کے میکے گیا۔ اُن کا گھر ہمارے گھر سے کچھ دُور تھا۔ راستے میں بیوی نے مجھے کہا کہ میں اُس کے گھر اُس کی شکایت نہ کروں ورنہ وہ مجھے بدنام کر دے گی۔ اسے بُزدلی کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ میں نے وہاں زبان نہ کھولی۔ وہاں سے واپس آئے تو رات ہم اپنے کمرے میں سونے لگے۔ میں نے اُس کی منّت سماجت شروع کر دی اور اُس سے پیار کی بھیک مانگنے لگا مگر وہ یہی جواب دیتی تھی کہ وہ قرآن کی قسم سے ڈرتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتی تھی کہ وہ مجھے بدنام نہیں ہونے دے گی۔

"لیکن اس کا انجام کیا ہوگا؟" میں نے ایک رات پٹپٹا کر پوچھا۔ "تم مجھ سے آزاد ہونا چاہتی ہو تو ہو جاؤ۔ تم میری بیوی نہیں تو یہاں پڑی کیا سوچ رہی ہو۔ میں کب تک تمہارے ہاتھ میں بندر کی طرح ناچتا رہوں گا۔ تم آخر کرو گی کیا؟"

"آپ تھوڑے دن مجھے اپنے ساتھ رکھیں"۔ اُس نے التجا کے لہجے میں کہا۔ "خدا آپ کو اس نیکی کا اجر دے گا۔ آپ نے ایک مظلوم لڑکی کو پناہ دے رکھی ہے۔ کیا آپ نے اس ظلم کو محسوس نہیں کیا جو میرے ساتھ ہُوا ہے؟ کیا اسلام ایسی شادی کی اجازت دیتا ہے جو لڑکی کی رضامندی کے بغیر ہوئی ہو؟ اس دھوکے میں میرا باپ، میرے بھائی اور نکاح پڑھانے والا مولوی شریک تھے۔ یہ دھوکہ صرف میرے ساتھ نہیں، آپ کے ساتھ بھی ہُوا ہے۔"

میں اس لڑکی کو چاہتا تھا۔ اسے میں نے خود پسند کیا تھا۔ میں دل میں اس امّید کو پال رہا تھا کہ یہ لڑکی میری ہو جائے گی۔ اس کی اس حالت کو میں عارضی سمجھتا تھا۔ مجھے یہ امید پوری ہوتی نظر آنے لگی کہ یہ جذبات کا ابال ہے جو چند دنوں میں بیٹھ جائے گا۔ میں اس امید کے سہارے جبر کیے رہا، مگر میں اعتراف کرتا ہوں کہ میری برداشت کی وجہ صرف یہی نہیں تھی۔ میں بتا چکا ہوں کہ اُس نے مجھ پر کمتری کا احساس

طاری کر دیا تھا اور میں بزدل بھی ہو گیا تھا، اور اُس نے میرے دل میں قرآن کی توہین اور حشر کا خوف بھی پیدا کر دیا تھا۔

میری چھٹی ختم ہو گئی۔ میں لاہور اپنی نوکری پر چلا گیا۔ اُن دنوں کرائے کے مکان اتنے خالی ملتے تھے کہ کرایہ دار ایک ہی دن میں پانچ سات مکان دیکھ کر اپنی پسند کا مکان لے لیتا تھا۔ میں جب لاہور میں اکیلا اور بیوی سے دُور ہُوا تو میرے اندر غصّہ بھرنے لگا۔ غصّہ انتقام کی آگ بن گیا۔ کبھی ارادہ کرتا کہ لڑکی کو طلاق لکھ کر بھیج دوں اور سب کو بتا دوں کہ اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ کبھی یہ خیال آتا کہ کسی وکیل سے مشورہ لوں اور اپنے سُسر اور اُس کے بیٹوں کے خلاف مقدمہ دائر کر دوں۔ میں نے اس پر بھی غور کیا کہ لڑکی اگر بتا دے کہ وہ کسے چاہتی ہے تو اُس آدمی کو قتل کر دوں۔

سب سے زیادہ تکلیف دہ مسئلہ یہ سامنے آگیا کہ کرائے کا مکان لے کر بیوی کو ساتھ لے آؤں یا نہیں۔ سوچ سوچ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ میرے پاس آجائے تو شاید میرے ساتھ دل لگا لے گی۔ اپنے پاس نہ رکھنے کی صورت میں مجھے یہ خطرہ نظر آرہا تھا کہ وہ جسے چاہتی ہے اُسے ملتی رہے گی۔ لاہور آگئی تو اُس سے مل نہیں سکے گی۔

میں نے کرائے پر مکان لے لیا۔ ہفتے کے روز گھر گیا اور اتوار کے روز اُسے لے آیا۔ اُس نے آنے سے انکار نہ کیا مگر میری بیوی بننے سے مُنکر رہی۔ ہم ایک ہی گھر میں اس طرح رہ رہے تھے جیسے دو مسافر اپنی اپنی منزل کو روانہ ہو جانے تک سرائے میں اکٹھے ہو گئے ہوں۔ ہماری آپس میں باتیں ہوتی رہتی تھیں۔

تقریباً بیس روز گزرے۔ میں دفتر گیا۔ جسم ٹوٹنے لگا۔ سر پھٹنے لگا۔ میں ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔ تیز بخار تھا۔ دوائی لے کر گھر کو چل پڑا۔ میرا مکان اس طرح تھا کہ ایک ڈیوڑھی تھی جو تین مکانوں کی مشترک تھی۔ میرے مکان کا دروازہ ڈیوڑھی میں کھلتا تھا اور ایک کمرے کا دروازہ بھی ڈیوڑھی میں ہی کھلتا تھا۔ دروازے کے ساتھ دو کھڑکیاں تھیں۔ میں بخار کی وجہ سے آہستہ آہستہ چلتا ڈیوڑھی میں داخل ہُوا۔ کمرے کا دروازہ اور کھڑکیاں حسبِ معمول بند تھیں۔ مجھے کمرے میں سے اپنی

بیوی کی سخت غصیلی آواز آئی۔

"دفع ہو جا... نکل جا یہاں سے کافر کی نسل" — اُس نے چلّا کر کہا۔

مجھے یوں لگا جیسے میرا بخار اُتر گیا ہو۔ میں مرنے مارنے کے لیے تیار ہو گیا۔ کوئی آدمی میرے گھر میں گھس آیا اور میری بیوی کو پریشان کر رہا تھا۔ اگر میری بیوی کی آواز ایک بار پھر نہ سُنائی دیتی تو میں چیتے کی طرح اندر جاتا اور وہ جو کوئی بھی تھا اُسے چیر پھاڑ ڈالتا۔

"میں شادی کر کے بھی کنواری ہُوں" — اُس نے کہا — "میں اس آدمی کو دھوکہ نہیں دُوں گی جس نے میری قسم نہ ٹوٹنے دی اور میرا خاوند ہوتے ہوئے اُس نے میرے جسم کو ہاتھ تک نہ لگایا۔"

"میں نے بھی قسم کھائی تھی" — یہ ایک مرد کی آواز تھی — "میں تمہارے لیے ہی تو آیا ہوں۔ تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ کسی کو شک نہیں ہوگا۔"

یہ مردانہ آواز مانوس لگی۔ میری بیوی اُس کا نام لے کر اُس پر برسی تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ میرے قصبے کے ایک میرے ہم عمر کی آواز ہے۔ وہ میرا دوست تو نہیں تھا لیکن ایک ہی جگہ کے رہنے والے ہونے کی وجہ سے ہمارا اٹھنا بیٹھنا دوستوں کی طرح تھا۔ یہ شخص زندہ دل جوان تھا۔ خوشحال گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ میں جب اپنی بیوی کو لاہور لایا تو دو تین روز بعد وہ سیر سپاٹے کے لیے لاہور آیا اور مجھے ملا تھا۔ اُس کے قریبی رشتے دار لاہور میں رہتے تھے۔ وہ اُن کے ہاں ٹھہرا تھا۔ مجھے دفتر میں ملا اور میرے گھر کا پتہ لے کر اگلے ہی روز دو جوان لڑکیوں کو ساتھ لے کر میرے گھر آیا تھا۔ یہ اُس کے رشتہ داروں کی لڑکیاں تھیں۔ میری بیوی چونکہ پردہ نہیں کرتی تھی اس لیے اُس نے اس آدمی سے پردہ نہ کیا اور لڑکیوں نے مجھ سے پردہ نہ کیا۔

میں نے دیکھا کہ میری بیوی غیر معمولی طور پر خوش تھی۔ میرے ساتھ وہ ناراض تو نہیں رہتی تھی لیکن میں نے اُس میں خوشی کے آثار کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ گھر کا ہر کام دلچسپی سے کرتی تھی۔ اُس کے انداز سے یہ تو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ اُسے میری ذات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کبھی مجھے شک ہونے لگتا

کہ اُس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں اور اتنی خوبصورت لڑکی کا رشتہ مجھے اسی لیے فوراً دے دیا گیا تھا کہ اس پاگل کو اور کوئی قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ پاگل پن ہی تھا کہ ایک طرف اُس کے دل میں قرآن کا اتنا احترام تھا کہ قسم توڑنے کو گناہِ کبیرہ سمجھتی تھی مگر دوسری طرف اُس کے اخلاق کا یہ حال کہ اُس نے مجھے خاوند تسلیم نہ کرنے کی قسم قرآنِ پاک پر ہاتھ رکھ کر کھائی تھی۔ اسے وہ قرآن کی توہین نہیں سمجھتی تھی۔

کبھی مجھے اپنے آپ پر شک ہونے لگتا کہ اُس کا دماغ صحیح ہے، میں پاگل ہوں۔ شاید آپ بھی یہی کہیں گے کہ میرا دماغ صحیح نہیں تھا ورنہ میں نے کیسے ایسی لڑکی کو جو مجھے اپنا خاوند ہی تسلیم نہیں کرتی تھی، بزدلوں اور بے غیرتوں کی طرح گھر میں رکھا ہُوا تھا۔ میں اس کی وُجوہات بیان تو کر چکا ہوں لیکن اچھی طرح بیان نہیں کر سکا۔

میں آپ کو سُنا رہا تھا کہ میرا دوست اپنی دو رشتہ دار لڑکیوں کو ساتھ لیے میرے گھر آیا تو میں نے اپنی بیوی کو پہلی بار خوش دیکھا۔ مجھے شک ہُوا کہ میری بیوی اسی آدمی کو چاہتی ہے لیکن یہ شک یہ سوچ کر دل سے نکال دیا کہ وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کو دیکھ کر خوش ہے۔ میرا دوست اور لڑکیاں ہم سے یہ وعدہ لے کر چلی گئیں کہ ہم اُن کے گھر آئیں گے۔ ایک روز ہم دونوں اُن کے گھر گئے۔ وہ اچھے لوگ تھے۔ رہن سہن امیرانہ تھا۔ تین چار روز بعد میرا دوست ان لڑکیوں کے ساتھ پھر ہمارے گھر آیا۔ خوب گپ شپ رہی۔ لڑکیاں میرے دوست کی طرح زندہ دل تھیں۔

ان کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ اپنے اس دوست سے اور ان لڑکیوں سے ذکر کر دوں کہ میری بیوی میرے ساتھ کیا سلوک کر رہی ہے اور وہ اس کے دل میں میری محبّت پیدا کریں۔ میں نے یہ ارادہ اس امید پر کیا تھا کہ میری بیوی ان تینوں کے ساتھ بہت بے تکلّف ہو گئی تھی اور ان سے متاثر بھی تھی۔ میرے دوست کو لاہور سے جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ کہتا تھا کہ وہ نوکری کی تلاش میں آیا ہے۔

میں سوچتا ہی رہا اور ایک روز مجھے دفتر میں بخار ہو گیا۔ میں اپنے مکان

کی ڈیوڑھی میں پہنچا تو مجھے اپنے کمرے سے اپنی بیوی کی غصیلی آواز سُنائی دی، پھر میرے اسی دوست کی آواز آئی۔ میں ڈیوڑھی میں ہی رُک گیا۔ میری بیوی کی آواز میں غصّہ اور قہر تھا اور میرا دوست ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ مجھے دونوں کا ایک ایک لفظ آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ میں یہ الفاظ دہراؤں گا نہیں۔ اپنی بیوی کا ایک جملہ دہرا دیتا ہوں۔

"قرآن کی قسم کھا کر آج تم مجھے بدکار بنانے آئے ہو"۔ میری بیوی نے کہا "تم نے مجھے اپنی بیوی بنانے کی قسم کھائی تھی اور میرے ساتھ ناجائز دوستی کرنا چاہتے ہو"

اس قدر لعنت ملامت کے باوجود میرا دوست ہنس کر بولا "دیکھو اتنی دُور سے آیا ہوں اور تم نے مجھے مایوس کر دیا ہے"

اُس نے ایک بیہودہ بات کہہ دی۔ مجھے ڈیوڑھی میں بڑی زور کا زناٹہ سُنائی دیا۔ میری بیوی نے اُس کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بیوی چلائی "نکل جا یہاں سے اور دیکھ قرآن پاک تجھ پر کس طرح لعنت بھیجتا ہے"

میرا جسم بخار سے جل رہا تھا۔ خون کھولنے لگا تو میرا دماغ ماؤف ہو گیا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے یہ فیصلہ کیوں کیا کہ میں اندر جانے کی بجائے باہر نکل گیا اور بے مقصد، بے منزل، آوارہ پھرتا رہا۔ مجھے صرف یہ احساس تھا کہ میرے جسم میں طاقت کی کمی ہے اور میں جل رہا ہوں مگر میں زندگی میں پہلی بار صاف ذہن سے اور سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ میرا کیا فیصلہ ہونا چاہیئے۔ مجھے اپنی بیوی کی غضبناک آواز اور تھپڑ سے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنے اخلاق کو ناپاک کرنے والی نہیں۔ میں نے اپنے دوست کی اس حرکت اور جرأت پر غور کیا تو اپنی بیوی کی طرح مجھے بھی غصّہ آنے لگا، مگر میرا جذباتی اُبال مجھے جس فیصلے پر لے جا رہا تھا، وہ بڑا ہی خطرناک تھا۔ میں اس فیصلے پر آ رہا تھا کہ اپنے دوست کو قتل کر دوں گا۔ میں اُسے اس جرم کی سزا دینا چاہتا تھا کہ اُس نے میری غیر حاضری میں میرے گھر میں بدکاری کی جرأت کی تھی، خواہ اپنی کوشش میں وہ ناکام ہی رہا تھا۔ اس کے قتل سے میرا دوسرا مقصد اسے اپنے اور اپنی بیوی کے درمیان سے ہٹانا بھی تھا۔

میں قتل کے مختلف طریقوں پر غور کرنے لگا۔ مجھے کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا تھا جس سے میرا سُراغ نہ ملتا۔ میں جُوں جُوں غور کرتا گیا میرا دل بیٹھتا گیا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھ میں کسی بھی طریقے سے قتل کرنے کی جرأت نہیں۔ اپنی بزدلی کو تسلیم کر لینے کے باوجود میرا غصّہ ٹھنڈا نہ ہُوا۔ اپنے آپ ہی غصّے کا رُخ بیوی کی طرف ہو گیا۔ میں یہ سوچ کر گھر کو چل دیا کہ میں بیوی سے بالکل نہیں پوچھوں گا کہ میرا دوست اُسے ملنے آیا تھا۔ میں انتظار کروں گا۔ اگر اُس نے خود بات نہ کی تو اسے لاہور سے گھر لے جاؤں گا اور اپنے گھر والوں اور اس کے گھر والوں کو بتا دُوں گا کہ اس نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا ہے اور اسے اس کے ماں باپ کے حوالے کر کے قطع تعلق کر لوں گا۔

میں بڑی ہی اذیّت ناک ذہنی حالت میں مبتلا گھر کو چل دیا۔ مجھے اپنے آپ پر غصّہ آنے لگا کہ میں اس لڑکی کی باتوں میں احمق بنا رہا۔ اگر میں جذبات سے مغلوب ہو گیا یا میں نے نیکی کی تھی تو یہ مجھے بہت بڑی بدی نظر آنے لگی۔ میرے آنسو بھی نکل آئے۔

میں اسی حالت میں گھر پہنچا۔ بیوی کمرے میں سَر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں ہر روز جس وقت دفتر سے گھر پہنچا کرتا تھا، اس سے کوئی ایک گھنٹہ پہلے گھر میں داخل ہُوا۔ بیوی نے چونک کر مجھے دیکھا۔ مجھے وقت سے پہلے گھر آتے دیکھ کر اور میرے اُترے ہُوئے چہرے کو دیکھ کر وہ تیزی سے اُٹھی اور میری طرف آئی۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ میں پلنگ پر گر پڑا اور جوتے اُتارے بغیر لیٹ گیا۔ اس نے میرے پاس بیٹھ کر پیار اور گھبراہٹ سے پوچھا کہ مجھے کیا تکلیف ہے۔ میرے ہاتھ میں دوائی کی شیشی تھی جو اُس نے میرے ہاتھ سے لے لی۔ میرے مُنہ سے اتنا ہی نکلا "بخار ہے"

اُس نے میرے جوتے اور جرابیں اتاریں۔ پاجامہ قمیض لے آئی اور مجھے کپڑے بدلنے کو کہا۔ اُس پر مجھے اتنا زیادہ غصہ تھا جو میری برداشت سے باہر تھا مگر اُسے دیکھ کر غصّہ ٹھنڈا ہونے لگا۔ میں نے اُس کے اصرار پر کپڑے بدلے اور خاموشی سے لیٹ گیا۔

وہ میرے سرہانے بیٹھی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ یہ آنسو میری تکلیف کے نہیں تھے، یہ اُس کے اپنے دُکھ کے آنسو تھے۔ وہ اچانک میرے پاؤں کی طرف ہو گئی اور سر میرے پاؤں پر رکھ کر سسکیاں لینے لگی۔ میں نے اُٹھ کر اُس کا سَر اُٹھایا تو وہ میرے ہاتھ پکڑ کر دیوانہ وار چُومنے لگی۔ میں اُس کے پاس پلنگ پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اُس نے سجدے کی طرح سَر میری گود میں پھینک دیا۔ اُس کی سسکیاں ہچکیوں میں بدل گئیں۔ مجھے کچھ بھی نہیں سوجھتی تھی کہ کیا کروں۔ میں نے کچھ بھی نہ کیا۔

تھوڑی دیر رو کر وہ سنبھلی تو اُس نے سَر اُٹھا کر میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور انہیں اپنے سینے پر رکھ کر بولی ــ "مجھے بخش دیں۔ آج سے میں آپ کی بیوی ہوں"۔

"قرآن پاک کی قسم کہاں گئی؟"۔۔ میں نے پوچھا۔

"اُس نے اپنی قسم توڑ دی ہے"۔ اُس نے جواب دیا "اب میں آزاد ہوں"۔

"وہ ہے کون؟"۔۔ میں نے انجان بن کر پُوچھا ۔۔ "اور یہ قصہ کیا ہے؟"

"وہ آپ کا دوست ہے جو لڑکیوں کو لے کر یہاں آتا رہا ہے" ۔۔۔ اُس نے جواب دیا ــ "آج وہ آپ کی غیر حاضری میں آیا تھا۔۔۔"۔ اُس نے مجھے پوری تفصیل سے سُنا دیا کہ میرے دوست نے کیا باتیں کیں اور میری بیوی نے اُسے کیا کچھ کہا اور گھر سے نکال دیا تھا۔ میں نے جو باتیں ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر سُنی تھیں وہ بھی اُس نے سُنائیں۔ میں نے اُسے نہ بتایا کہ میں ڈیوڑھی میں کھڑا سُن رہا تھا۔

"وہ اپنی قسم کو بھول گیا ہے" ۔ اُس نے کہا "وہ مجھے بدکاری اور عیاشی کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے۔ اُس نے یہاں تک کہا تھا کہ میری شادی ہونے والی ہے لیکن میں دوستی تمہارے ساتھ ہی رکھوں گا۔ میں نے اُسے دھتکار دیا ہے۔ وہ قسم توڑنے کی سزا سے بچ نہیں سکتا اور آپ کو نیکی کا صلہ ضرور ملے گا"۔

مختصر یہ کہ اُس کے دل میں جو کچھ تھا وہ اُس نے مجھے بتا دیا۔ اب وہ مجھ سے التجا کر رہی تھی کہ میں اُسے قبول کر لوں۔ میری کمزوری یہ تھی کہ یہ لڑکی مجھے بہت

اچھی لگتی تھی۔ میں نے تو اسے پہلے ہی قبول کر رکھا تھا۔ البتہ نکاح کا یہ پہلو میرے سامنے آ گیا کہ نکاح فارم پر لڑکی نے خود دستخط نہیں کیے تھے۔ اُس کے بیان کے مطابق اُس کے دستخط جعلی تھے۔ میں نے دوسرے دن محلے کی مسجد کے مولوی صاحب کو رازداری سے یہ سارا واقعہ سُنا دیا۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ نکاح نہیں ہُوا اور یہ لڑکی میری بیوی نہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں اس راز میں کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہتا۔ وہ کوئی بندوبست کریں اور نکاح صحیح کرا دیں۔

اُن دنوں نکاح پڑھانے والے مولوی کو پانچ روپے دیے جاتے اور امیر لوگ دس روپے دے دیا کرتے تھے مگر مولوی صاحب نے میری مجبوری سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے تیس روپے مانگے۔ میں نے سودا منظور کر لیا۔ رات کو مولوی صاحب نے اپنے گواہ لا کر باقاعدہ نکاح پڑھا دیا۔ تیس روپے خود وصول کیے اور دس دس روپے دو گواہوں کو مجھ سے دلوائے۔ اس طرح بلیک مارکیٹ پر میرا نکاح صحیح ہو گیا۔۔۔۔ اور ہم میاں بیوی بن گئے۔

اس سے دو روز بعد کا ذکر ہے کہ میں دفتر سے آیا تو وہ دو لڑکیاں جو میرے دوست کے ساتھ آیا کرتی تھیں میرے گھر آئی بیٹھی تھیں۔ میری بیوی نے مجھے بتایا کہ ان لڑکیوں کے بھائیوں نے میرے دوست کی اتنی پٹائی کی ہے کہ اُس کی آنکھ بُری طرح زخمی ہو گئی ہے اور وہ اپنے گھر چلا گیا ہے۔ یہ لڑکیاں بہنیں تھیں اور میرے دوست کی والدہ کے خالہ زاد بھائی کی بیٹیاں تھیں۔ ان کے دو بھائی بھی تھے۔ لڑکیوں نے میری بیوی کو بتایا کہ میرے دوست نے ان میں سے بڑی بہن کے ساتھ محبت کا اظہار کیا اور اُسے کہا کہ وہ کسی سہیلی سے ملنے کا بہانہ کر کے لارنس گارڈن چلی جائے جہاں میرا دوست اُسے مل جائے گا۔

لڑکی نے اسے شرافت سے ٹالا مگر وہ باز نہ آیا۔ لڑکی نے اپنے بھائیوں کو بتا دیا۔ بھائیوں نے میرے دوست کی پٹائی کر کے گھر سے نکال دیا۔ وہ اپنے گھر (میرے قصبے میں) زخمی حالت میں گیا تو اُسی روز اُس کا باپ اور ایک بھائی لاہور آ گئے۔ اُن کی لڑکیوں کے والدین اور بھائیوں سے تُو تُو میں میں ہوتی انہیں بھی گھر سے نکال دیا گیا

میں چند دنوں بعد اپنی بیوی کے ساتھ اپنے گھر گیا تو پتہ چلا کہ میرے دوست کی خبر آئی کہ ہمیشہ کے لیے بیٹھ گئی ہے۔ اس کے بعد اُس کے متعلق یہی [illegible] کہ آوارہ ہوگیا ہے۔ جُوئے بازوں میں اُٹھتا بیٹھتا ہے۔ چند سال بعد جب میں ایک لڑکی اور ایک لڑکے کا باپ بن چکا تھا، وہ کہیں غائب ہوگیا۔ پھر ہم اُسے بُھول گئے۔ خدا نے مجھے آزادی کے بعد اُونچا عہدہ دے دیا۔ ایک روز ہمارے قصبے کا رہنے والا ایک آدمی مل گیا۔ وہ پولیس میں سب انسپکٹر تھا۔ اُس نے میرے دوست کا نام لے کر مجھ سے پوچھا کہ وہ مجھے یاد ہے؟ میں نے بتایا کہ اچھی طرح یاد ہے۔ اُس نے کہا کہ وہ اُس کی حوالات میں چوری کے کیس میں بند ہے۔ سب انسپکٹر نے اُس سے گھر سے غائب ہونے کے بعد کے حالات پُوچھے تھے۔ وہ تو پہچانا بھی نہیں جاتا تھا۔ اُس نے جوانی چرسیوں، جواریوں اور رنڈیوں میں گزاری تھی اور اب اُس کی باقی زندگی جیل میں ہی گذرنی تھی۔

میری بیوی اکثر کہا کرتی تھی کہ یہ قرآن پاک کی توہین کی سزا ہے۔ مجھے بیوی نے نیکی کا بہت صلہ دیا ہے۔ اُس نے میری دو بیٹیوں کی تربیت ایسی کی ہے کہ انہیں صحیح معنوں میں اسلام کی بیٹیاں بنا کر اس دُنیا سے رخصت ہوئی ہے۔

چار بیٹے ایک بیٹی

میری حیثیت ایک عینی شاہد کی ہے۔ چونکہ اس کہانی کے کردار زندہ ہیں اس لیے میں فرضی نام لکھ رہا ہوں لیکن یہ کہانی فرضی نہیں اور نہ ہی یہ کہانی کوئی ایسی عجیب ہے۔ ہمارے معاشرے میں تو اس سے کہیں زیادہ عجیب و غریب ڈرامے دیکھنے میں آتے ہیں۔ میں اس گھرانے کے بالمقابل رہتا ہوں۔ جب نُور احمد کا باپ مرا تو اُس وقت نُور احمد کو شادی کیے شاید ایک سال ہوگیا تھا۔ آج نور احمد کو ضعیفی نے چارپائی پر ڈال دیا ہے۔ جوانی میں وہ کسی ورکشاپ میں تھوڑی سی تنخواہ پر کام کیا کرتا تھا۔ مکان اس کا اپنا تھا۔ اُس کے باپ کا کچھ روپیہ بھی تھا جو اُس نے دوسرے بیٹے کو دے دیا تھا اور مکان نُور احمد کے نام منتقل کر دیا تھا۔

باپ کے مرنے کے بعد دوسرا بیٹا جو اُس وقت ایک بچّے کا باپ تھا، نُور احمد سے الگ ہوگیا اور نُور احمد اپنی بیوی کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ شادی کو چار سال گذر گئے لیکن کوئی بچّہ نہ ہُوا۔ نُور احمد مسجد کے مولوی صاحب سے التجائیں کرنے لگا کہ دعا کریں کہ خدا اُسے اولادِ نرینہ دے پھر وہ ہر جمعرات بیوی کو ساتھ لے کر داتا دربار جانے لگا اور جب ایک سال گذر گیا تو وہ ایک پیر کا مرید بن گیا۔ یہ پیر شہر سے چند میل دُور ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ اس پیر کی بہت دُھوم تھی کہ بے اولادوں کو اولاد دیتا ہے اور مُردوں کو زندہ کر دیا کرتا ہے۔ نُور احمد اس پیر کی دہلیز پر ماتھا رگڑنے لگا اور اکثر بیوی کو بھی اس کے ہاں بھیجنے لگا۔

میں اور میرے تین چار دوست صرف خُدا اور اُس کے رسُولِ مقبول

صلّی اللہ علیہ وسلّم کو مانتے تھے۔ پیری مریدی کے نہ کبھی قائل ہوئے تھے اور نہ کبھی بھول گرے۔ ایک روز ہمیں پتہ چلا کہ نُور احمد کی بیوی اکیلی بھی پیر کے ہاں جاتی ہے اور دو دو تین تین دن اور راتیں وہاں گذارتی ہے تو ہم نے اشاروں اشاروں میں نُور احمد کو سمجھانے کی کوشش کی کہ خود وہاں چلا جایا کرے، بیوی کو نہ بھیجا کرے مگر نُور احمد نے ہمیں پیر کی کرامات سُنانی شروع کر دیں اور پورے وثوق سے کہنے لگا کہ پیر اس سال ضرور بچّہ دیں گے اور پہلا بچّہ لڑکا ہو گا۔ نور احمد کو صرف لڑکے کی خواہش تھی۔ مسجد کے مولوی صاحب سے جب دُعا کرایا کرتا تھا تو زور دے کر کہا کرتا تھا کہ مولوی صاحب! لڑکے کے لیے دُعا کرنا۔

آخر خدا نے نُور احمد کی دُعا قبول کر لی اور اُس کے گھر پہلا بچّہ پیدا ہُوا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اُس کی دُعا خدا تک پہنچائی کس نے تھی؟ ہُوا یہ کہ مولوی صاحب بھی منہ مانگا نذرانہ لے گئے۔ کہنے لگے کہ یہ اُن کی دُعاؤں کا کرشمہ ہے۔ دوسرے روز پیر صاحب دس بارہ خاص مریدوں کے ساتھ آن دھمکے۔ ایک بکرا زندہ لے گئے اور ایک دن میں وہ اور اُس کے مُرید نور احمد کے گھر کی وہی حالت کر گئے جو ٹڈی فصل کا کر جاتی ہے۔

ہم نے پیر کو پہلی بار دیکھا۔ وہ بیس بائیس سال کا خوبرو آدمی تھا۔ آنکھوں کی چمک، چہرے کی رونق اور لباس سے کسی مہاراجے کا اوباش بیٹا لگتا تھا۔ وہ کسی پہلو پاکباز اور عبادت گذار معلوم نہیں ہوتا تھا۔ معلوم ہُوا کہ اُس کا باپ مر گیا ہے۔ دُور دُور سے لوگ مُرادیں پوری کرانے آتے ہیں اور کوئی سوالی خالی نہیں جاتا۔

نُور احمد نے قرض لے کر پہلے بچّے کی خوشی میں اتنا پیسہ بہا دیا جتنا اُس کے باپ نے اُس کی شادی پر خرچ نہیں کیا تھا۔ دو سال گذر گئے تو دوسرا بچّہ پیدا ہُوا۔ یہ بھی لڑکا تھا۔ نُور احمد جو پہلے قرض کی ادائیگی سے ابھی فارغ نہیں ہُوا تھا اور قرض لے کر دوسرے لڑکے کی خوشی منانے لگا۔ اب تو میاں بیوی پیر کے زرخرید غلام بن گئے۔ قرض سودی تھا جو دو ہندوؤں سے لیا گیا تھا۔ معلوم ہُوا کہ نور احمد ہر مہینے جو ادائیگی کرتا ہے وہ صرف سُو روپے

کی رقم ہوتی ہے۔ اصل زر روزِ اوّل کی طرح سر پر موجود ہے لیکن نُور احمد کو کوئی غم نہ تھا۔ اس قدر اطمینان سے باتیں کیا کرتا تھا جیسے پیر کی برکت سے خدا اُس کی چھت پھاڑ کر دولت دے گا اور قرض ادا ہو جائے گا۔ حالانکہ اُس کی بیوی کا سارا زیور گروی رکھا ہُوا تھا۔

دو سال اور گذر گئے اور تیسرا لڑکا پیدا ہُوا۔ اس دوران نُور احمد کی بیوی مہینے میں ایک بار پیر کے گاؤں باقاعدگی سے جاتی رہی اور پیر دوسرے تیسرے مہینے آتا رہا۔ وہ جب بھی آتا چند ایک مریدوں کو ساتھ لاتا اور تین چار روز خوب مرغن دعوتیں اُڑا کر چلا جاتا۔

نُور احمد دونوں ہندوؤں کا سُود ادا کرتا رہا لیکن اس کو قرض کا بوجھ کسی بھی وقت محسوس نہ ہُوا۔ ایک روز اُس کا بھائی، بیوی بچّوں سمیت اُس کے گھر آیا تو تھوڑی دیر بعد نُور احمد کی بیوی کی جلی کٹی باتیں سُنائی دینے لگیں چند منٹوں بعد اچھی خاصی لڑائی شروع ہو گئی۔ پھر دونوں بھائی جھگڑنے لگے۔ ہم نے دیکھا کہ اُس کا بھائی سخت خفگی میں بیوی بچّوں کو ساتھ لیے اپنے گھر جا رہا تھا۔ معلوم ہُوا کہ بھائی اور اُس کی بیوی نے نُور احمد کو کہہ دیا تھا کہ اپنی مالی حیثیت کے مطابق خرچ کرو اور سُودی قرضے کی لعنت سے آزاد ہونے کی کوشش کرو۔ بھائی کا کاروبار اچھا تھا۔ اُس نے مالی مدد کی بھی پیش کش کی لیکن نُور احمد اور اُس کی بیوی نے اسے بے عزتی سمجھ کر اُن سے لڑائی جھگڑا شروع کر دیا اور جب دونوں ہندو ساہوکاروں کے منشی باری باری سُود کی رقم لینے آیا کرتے تھے تو نُور احمد اسے بے عزّتی نہیں سمجھا کرتا تھا۔

اب نُور احمد نے مسجد میں بھی جانا چھوڑ دیا۔ وہ پیر کی مریدی اور تین بیٹوں کی خوشی سے سرشار رہتا تھا۔ اس میں اب غرور بھی پیدا ہو چلا تھا۔ ہر کسی سے موقع بے موقع کہا کرتا تھا کہ جس باپ کے تین بیٹے ہوں اُسے کیا غم!

ان ہی دنوں میرے گھر دوسری بیٹی پیدا ہوئی تو نُور احمد نے کچھ طنزیہ سے لہجے میں کہا کہ بیٹیاں بدنصیبوں کے گھر پیدا ہُوا کرتی ہیں۔ پھر ایک روز اُس نے بیٹیوں سے نفرت کا اظہار ایسے الفاظ میں کیا جو میں یہاں لکھنا نہیں چاہتا۔

یہ الفاظ آج تک میرے سینے پر کندہ ہیں۔

تین سال اور گذر گئے تو نُور احمد کے گھر چوتھا بیٹا پیدا ہُوا۔ اُس وقت اُس کا پہلا بیٹا دوسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ نُور احمد کی گردن اب بالکل ہی اکڑ گئی۔ اُسے اب دُنیا کے دو ہی انسان اچھے لگتے تھے۔ اپنا پیر جس نے اولاد عطا کی اور اپنی بیوی جو لڑکے ہی لڑکے جنتی چلی جا رہی تھی۔ ہر کسی سے کہتا پھرتا تھا کہ میری بیوی بھاگوان ہے۔ اس نیک بخت نے میرے گھر میں چار چاند لگا دیے ہیں — اور پیر کا نام لیتے تو وہ اپنا ہاتھ چوم لیا کرتا تھا۔

ایک روز میری بیوی نے نُور احمد کی بیوی سے کہا کہ اب خدا تمہیں ایک لڑکی دے دے تو گھر مکمل ہو جائے۔ چار بھائیوں میں ایک بہن بڑی اچھی لگتی ہے۔

"لعنت بھیجو لڑکی پر"۔ نُور احمد کی بیوی نے نفرت سے کہا — "لڑکیاں تو بدبختوں کے گھروں میں پیدا ہوتی ہیں"۔

اور ایک روز میں بھی نُور احمد سے یہی بات کہہ بیٹھا تو اُس نے جواب دیا — "لڑکیاں تمہیں ہی مبارک ہوں مردوں کی اولاد مرد ہی ہُوا کرتے ہیں"— اس کے ساتھ ہی اُس نے محلّے کے دو تین گھروں کی جوان لڑکیوں کے چال چلن کے متعلق بے بُنیاد باتیں سُنا ڈالیں۔ کسی لڑکی کو کسی کے بیٹے کے ساتھ وابستہ کر دیا اور کسی کی بیٹی کو ان الفاظ کے ساتھ آوارہ کہہ ڈالا — "میں نے خود دیکھا ہے"— اور اُس نے یہ بھی کہا کہ لڑکیاں خاندان کی عزّت کو ڈبونے کے لیے پیدا ہوتی ہیں — "اور خدا جسے اس دُنیا میں کسی گناہ کی سزا دینا چاہے تو اُس کے گھر ایک دو لڑکیاں پیدا کر دیتا ہے"۔

میں چُپ رہا لیکن دل کو سخت چوٹ لگی۔ میں بھی دو بچیوں کا باپ تھا۔ ان دو بچیوں کو میں نے کبھی بھی خدا کی لعنت اور گناہوں کی سزا نہیں سمجھا تھا۔

میں سوچا کرتا تھا کہ میری بچیوں کی ماں بھی لڑکی ہی تھی جو اُس وقت میرے گھر آئی تھی جب میں کاروبار میں ناقابلِ برداشت خسارے کی وجہ سے زندگی سے ہی بیزار ہو گیا تھا۔ والد صاحب مر چکے تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ دھوم دھام سے شادی کروں لیکن چُپ چاپ یہ رسم ادا ہو گئی۔ میرے سسرال مالی لحاظ سے آسودہ

تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ اُن کی بیٹی میری تنگ دستی سے پریشان ہو گی اور شاید مجھے اچھا بھی نہ سمجھے لیکن وہ آئی تو چند دنوں بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ میرا نصیبہ بن کر آئی ہے۔ اُس نے مجھے نیا حوصلہ دیا اور میری تنگدستی کو میری خوش نصیبی بنا دیا۔ یہ میری بیوی کا ہی کارنامہ تھا کہ اُس نے مجھے عجیب سے جوش و خروش سے زندگی کی راہ پر رواں کر دیا اور میں نے کاروبار کی گری پڑی دیواروں پر نئی عمارت کھڑی کر لی۔ میں بھلا نُور احمد کی بات کیوں مان لیتا کہ لڑکیاں بدبختی کی نشانی ہیں۔

خدا کا کرنا کیا ہُوا کہ نور احمد کے گھر بچی پیدا ہو گئی اور میں نے اُسے گلی میں یُوں سر جُھکائے اور افسردہ سا جاتے دیکھا جیسے اُس کے چاروں بیٹے مر گئے ہوں۔ میں نے اُسے اس حال میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ روک کر پوچھا تو کہنے لگا کہ قسمت دھوکا دے گئی ہے۔ خدا اس ڈائن کو سنبھال ہی لے تو اچھا ہے۔ میں نے اُسے تسلی دی لیکن اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

دوسرے روز مجھے بیوی نے بتایا کہ نُور احمد اپنی بیوی کو کوس رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ تم پیر کے پاس جاتی رہتی ہو، تم سے ضرور کوئی بدپرہیزی یا بے ادبی ہوئی ہے۔ اُس کی بیوی زار و قطار رو رہی تھی اور قسمیں کھا رہی تھی کہ وہ پیر کا ہر حکم بسر و چشم بجا لاتی رہی ہے اور اس سے کوئی بے ادبی نہیں ہوئی۔

چند ہی دنوں بعد ایک ہندو ساہوکار کا منشی آ گیا۔ اُس نے گلی میں کھڑے ہو کر نُور احمد سے کہا کہ نو دس سال سے تم اصل زر کا ایک پیسہ نہیں دے سکے بلکہ سُود کی بھی کچھ رقم باقی ہے۔ اب ایک ہی صورت ہے کہ مکان کی رجسٹری دے دو۔

تین چار دنوں بعد یہی مطالبہ دوسرے ساہوکار نے کر دیا اور نُور احمد سر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ پھر اُسے یہ کہتے سُنا گیا کہ یہ اس بچّی کی نحوست ہے کہ باپ دادا کا بنا بنایا مکان ہاتھ سے جا رہا ہے۔ اس کی نگاہ میں وہ خود بھی بے قصور تھا، ہندو ساہوکار بھی بے قصور اور پیر صاحب بھی بے قصور جو اس عرصے میں قرض کی آدھی رقم نذر نیاز اور دعوتوں کی صورت میں کھا گئے تھے۔

نورُاحمد کے بھائی کو پتہ چلا کہ اُس کے باپ کا خون پسینہ نورُاحمد کے ہاتھوں ہندوؤں کی تجوریوں میں جا رہا ہے تو اُس نے نورُاحمد سے کہا کہ وہ سُود ادا کرتا رہے اور اصل زر کی کچھ رقم وہ ہر مہینے خود ادا کرتا رہے گا۔ چنانچہ یہ تسلسل چل پڑا اور مکان بچ گیا۔ پیر بادشاہ اور ہندو ساہوکار نورُاحمد کو دیمک کی طرح کھاتے رہے اور گھر میں فاقوں تک نوبت پہنچنے لگی۔ اب نورُاحمد نے پیر سے اولادِ نرینہ کی بجائے روپے پیسے کی غیبی مدد مانگنی شروع کردی۔

تین چار سال گذر گئے لیکن اُسے کوئی غیبی مدد نہ ملی۔ ہندو ساہوکاروں نے اصل زر کا مطالبہ شدید کردیا اور آئے دن اُسے دھمکیاں دینے لگے کہ وہ قانونی چارہ جوئی کر کے اُس کا مکان نیلام کروا دیں گے، حالانکہ اُس کی بیوی کا سارا زیور اُن کے پاس گروی رکھا تھا۔ نورُاحمد نے قسط کی رقم بڑھا دی اور اپنے بھائی کی منت سماجت کر کے اُس سے بھی زیادہ قسط ادا کروانے لگا۔ گھر میں اب تنگ دستی کا جان لیوا دور شروع ہو گیا لیکن پیر اپنی نذر نیاز اور شیرینی باقاعدگی سے وصول کرتا رہا۔

نورُاحمد کی بیٹی ماں باپ کی نفرت بھری ڈانٹ پھٹکار اور مار پٹائی میں چار سال کی ہو گئی۔ اُس کا بڑا بھائی چھٹی جماعت میں تھا، اس سے چھوٹا شاید تیسری یا چوتھی میں اور اس سے چھوٹا پہلی جماعت میں تھا۔ ایک روز ہم نے نورُاحمد کو پھر سر پکڑے دہلیز پر بیٹھے دیکھا۔ ہم سمجھے شاید اُس کے گھر ایک اور لڑکی پیدا ہو گئی ہے۔ معلوم ہُوا کہ اُس کا بڑا بیٹا ایک روز پہلے سکول گیا تھا گھر واپس نہیں آیا۔ وہ کل دن اور رات بھر سے غائب تھا۔ نورُاحمد نے بتایا کہ وہ سکول پتہ کرنے گیا تو اُس کے ماسٹروں نے کہا کہ لڑکا کئی دنوں سے سکول سے غیر حاضر ہے اور اکثر غیر حاضر رہتا ہے۔ نورُاحمد کہتا تھا کہ لڑکا ہر صبح بستہ اُٹھائے سکول جاتا ہے اور چھٹی کے وقت گھر آجاتا ہے۔ اُس کے ہم جماعتوں نے بھی اپنے ماسٹروں کی تائید کی۔ کھُلتے کھُلتے راز کھُلا کہ لڑکا چند ایک لڑکوں کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے نکل جاتا ہے۔ عام طور پر یہ لڑکے منٹو پارک میں پتنگ بازی کیا کرتے تھے۔ ایک شہادت یہ بھی ملی کہ یہ لڑکے چوری چھپے سگریٹ بھی پیتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ نورُاحمد نے اس بچے کو پہلا بچہ اور لڑکا ہونے کی وجہ سے بے جا لاڈ پیار سے پالا تھا۔ اس طرح وہ باقی تین لڑکوں کو بھی ترغیب دے کر بگاڑتا رہا۔ جب بچے نے پر پُرزے نکالے گھر میں تنگدستی کا دَور دَورہ شروع ہو گیا۔ صرف بڑا بچہ ہی نہیں دوسرے بچے بھی پہلے کی سی عیش و عشرت ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ اپنی بات منوانے اور ہر فرمائش پوری کروانے کے عادی ہو چکے تھے لیکن گھر میں اب غربت تھی۔ انہیں وہ وقت یاد آتا تھا جب ماں باپ ہر وقت ہنستے اور مُسکراتے تھے۔ بچوں کو یہ علم نہیں تھا کہ اُن کے والدین نے وہ ہنسی ہندو ساہوکاروں سے سُود پر لی تھی، جو اب غموں میں بدل گئی تھی۔ بچوں کو اب ماں باپ کے چہرے پر اُداسیاں اور گھر میں ویرانیاں نظر آئیں تو وہ گھر سے بھاگنے لگے۔

بڑا لڑکا چار روز بعد گھر آیا۔ معلوم نہیں کہ اُسے باپ نے مارا پیٹا یا پیار سے سمجھایا لیکن اتنی سی بات کا علم ہو گیا کہ وہ اپنے آوارہ دوستوں کے ساتھ ریل گاڑی میں بے ٹکٹ بیٹھ گیا تھا اور جہلم تک بے ٹکٹ سیر کر آیا تھا۔ اگر ان لڑکوں کو پولیس آوارہ گردی میں پکڑ نہ لیتی تو جانے وہ سب کہاں تک جا پہنچتے۔ معلوم نہیں پولیس نے انہیں کس طرح چھوڑ دیا اور وہ واپس آگئے۔

وقت گذرتا چلا گیا۔ یہ لڑکا تو ہاتھ سے نکل ہی گیا تھا، دوسرے دونوں لڑکے بھی سکول سے بھاگنے لگے۔ جب چوتھے کو سکول میں داخل کرانے کا وقت آیا تو ہزار مار پٹائی کے باوجود وہ سکول میں نہ ٹھہرا۔ بھاگ کر گھر آجاتا یا کہیں اور نکل جاتا اور چھٹی کے وقت گھر آجاتا۔

بچی کی یہ حالت تھی کہ ماں اور باپ اُٹھتے بیٹھتے اُسے گالیاں دینے لگے۔ اُن کی نگاہ میں یہ اسی معصوم کی نحوست تھی کہ اولادِ نرینہ گمراہ ہو گئی تھی۔ اُس دَور میں لڑکیوں کو تعلیم دلانے کا رواج نہ تھا۔ لہٰذا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ بچی کو سکول میں داخل کرایا جائے۔ اس بچی کو میں اکثر دیکھا کرتا تھا۔ نہ اُس میں بچپن کی شوخی تھی نہ وہ بچوں کے ساتھ کھیلتی۔ وہ تو چھوٹے سے قد کی عورت لگتی تھی۔ علی الصبح اٹھ کر سارے گھر میں جھاڑو دیا کرتی تھی۔ برتن دھویا کرتی تھی

اور دن بھر چھوٹی سی بالٹی اُٹھائے مسجد کے ہینڈ پمپ سے پانی لاتی رہتی تھی۔ وہ روتی تھی نہ ہنستی تھی۔

نُور احمد اپنے بیٹوں کی آوارگی کا علاج بھی پیر کے حجرے میں ڈھونڈنے لگا۔ اُس کی بیوی میری بیوی کو بتایا کرتی تھی کہ پیر صاحب نے بچوّں کو پانی میں گھول کر پلانے کے لیے تعویذ دیے ہیں اور انہوں نے اپنے باپ کے مزار کی مٹی بھی بچوّں کو کھلانے کے لیے دی ہے لیکن ہم دیکھ رہے تھے کہ تعویذوں کا پانی اور مزار کی مٹی کیا اثر کر رہی تھی۔ چاروں میں سے کوئی نہ کوئی گھر سے بھاگا ہُوا ہوتا تھا اور جب یہ لڑکے گھر میں ہوتے تھے تو اُن کی گالیاں سارا محلہ سُنا کرتا تھا۔ باپ نے تنگ آ کر اب اُن کی پٹائی بھی شروع کر دی تھی جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

ایک روز میں نے نُور احمد کی بچیّ کو دہلیز پر بیٹھے دیکھا۔ وہ پنسل کے چھوٹے سے ٹکڑے سے کاغذ پر اُلٹی سیدھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ مجھے اُس پر ترس آ گیا۔ میں نے اُسے بُلایا تو وہ یوں خوفزدہ سی ہو کر میری طرف آہستہ آہستہ چل پڑی جیسے میں نے اُسے چوری کرتے پکڑ لیا ہو۔ مجھ تک پہنچتے اُس نے ہر قدم پر پیچھے اپنے گھر کی طرف دیکھا۔ میں اُسے اندر لے آیا۔

"یہ کیا لکھ رہی ہو؟"— میں نے اُس سے پوچھا۔

وہ چُپ چاپ کھڑی رہی۔ میں نے بہت کوشش کی کہ وہ کوئی بات کرے لیکن وہ میرے مُنہ کی طرف دیکھتی رہی۔ میں نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ جب اُسے اپنے قریب کر لیا تو وہ ڈر گئی اور کہنے لگی —"میں گھر جاتی ہوں۔ ابّا مارے گا"— لیکن میرے پیار نے اُس کا ڈر دُور کر دیا۔

"تم پڑھنا چاہتی ہو؟"— میں نے پوچھا۔

"ہاں"— اُس نے بے ساختگی سے کہا۔

میں اُسے کاغذ پر الف ب لکھ کر دکھانے لگا تو وہ منہمک ہو گئی۔

اُس کے شوق سے متاثر ہو کر میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ اُس کی ماں سے بات کرے۔ اگر وہ اجازت دے تو بچیّ ہماری بچیّوں سے پڑھ لیا کرے۔ میری بیوی نے اُس کی ماں سے بات کی تو اُس نے کہا کہ جنہیں پڑھانا تھا وہ تو بھاگے

بھاگے پھر رہے ہیں۔ اس نامراد کو پڑھا کر کیا کریں گے۔

میری بیوی نے اُسے قائل کر لیا اور بچیّ میرے گھر آنے لگی۔ ہم نے اُسے قاعدہ، تختی، پنسل، قلم اور دوات وغیرہ لے دی اور وہ پُورے شوق سے پڑھنے لگی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ماں باپ کی پھٹکار اور گھر کے جلے کٹے ماحول سے بھاگ کر 'الف ب' پڑھنے میں فرار محسوس کرتی ہو۔ اُس کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ وقت وہ ہوتا تھا جب وہ میرے گھر سے جانے لگتی تھی یا ماں اُسے دروازے میں کھڑے ہو کر چلّا چلّا کر بُلانے لگتی تھی۔ بچیّ کا کھِلا ہُوا چہرہ بُجھ جاتا تھا اور میری بچیّوں کو ترسی ہوئی نظروں سے دیکھتے اپنے گھر چلی جاتی تھی۔

نُور احمد دن بھر ورکشاپ میں رہتا تھا۔ شام کے وقت گھر آتا تو کسی نہ کسی بیٹے کو گالیاں دینے یا پیٹنے لگتا تھا لیکن زیادہ تر پٹائی کا شکار اُس کی بچیّ ہوتی تھی۔ میں نے گالیوں کے ساتھ اُس کا یہ فقرہ اکثر سُنا تھا —"ایسی ڈائن پیدا ہوئی کہ چار بیٹے ہوتے ہُوئے گھر اُجڑ گیا۔"

پھر وہ وقت آیا کہ بڑے لڑکے نے گھر سے چیزیں چُرا کر کہیں بیچنی شروع کر دیں۔ اب تو یہ لڑکا کئی کئی دن گھر سے غیر حاضر رہتا تھا۔ دوسرے لڑکے بھی بڑے بھائی کے نقشِ قدم پر چل پڑے۔ نُور احمد بڑے بھائی کی مدد سے ساہوکاروں کا سُود اور تھوڑی سی قسط اصل زر کی دیتا رہا اور اُس کا پیر تین چار مہینوں بعد آ کر اپنی قسط وصول کر جاتا تھا۔ چنانچہ چار بیٹوں، دو ساہوکاروں اور ایک پیر نے نُور احمد کی کمر توڑ ڈالی اور اُس کی بیوی بہت تیزی سے بوڑھی ہونے لگی۔

بڑا لڑکا پندرہ سولہ برس کا ہُوا تو وہ محلّے میں ہی نہیں شہر کی اس ساری آبادی کا مانا ہُوا غنڈہ بن گیا۔ گو ابھی اُس نے اپنے گھر کے سوا اور کہیں چوری یا جیب تراشی نہیں کی تھی، اُسے جُوئے، چرس اور لڑائی مارکٹائی سے محبّت ہو گئی تھی۔ اس کی اتنی سی برخورداری کو میں ضرور تسلیم کرتا ہوں کہ جُوئے کی بازی جیت جاتا تو اُس میں سے باپ کو چند روپے ضرور دے دیا کرتا تھا۔ اُس کے چھوٹے بھائی اُس کی راہ پر چلے جا رہے تھے اور باپ صبح شام آہ وزاری کرتا رہتا تھا۔ جب اُکتا جاتا تھا تو ذرا سی بات پر بچیّ کو دو چار تھپڑ مار کر غصّے کو ٹھنڈا کر لیا کرتا تھا۔ لڑکے تو

گھر سے بھاگ جاتے تھے لیکن لڑکی اتنے ظلم و تشدد کے باوجود نہ بھاگی۔ بھاگنا تو اُسے چاہیئے تھا لیکن شاید اپنی کمزوریوں سے آگاہ تھی اور ماں باپ کی پناہ کو چھوڑتے ڈرتی تھی۔

جب لڑکا جوان ہو گیا تو کئی روز نظر نہ آیا۔ اُس کے باپ سے پوچھا تو معلوم ہُوا کہ اُسے اُس کا پیر اپنے گاؤں لے گیا ہے۔ نُور احمد نے کہا کہ پیر جی کہتے تھے کہ میں اسے چند دنوں میں انسان بنا دوں گا۔ دوسری جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ جنگ کے دُوسرے سال کے دوران نُور احمد کا دوسرا بیٹا فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اُس کی ماں چند دن روتی رہی پھر چپ ہو رہی۔ باقی دونوں بیٹے سکول سے بالکل ہی چھٹی کر چکے تھے۔ وہ دن بھر پتنگ بازی میں شہر کی خاک چھانتے رہتے تھے۔

بچّی جو اَب چودہ پندرہ سال کی ہو گئی تھی میرے ہاں دو بار قرآن ختم کر چکی تھی اور چھٹی جماعت تک اُردو کی کتابیں پڑھ لیتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ نماز کی بہت ہی پابند تھی۔ وہ کمسن تو لگتی ہی نہیں تھی۔ باتوں میں غمزدہ سی سنجیدگی اور ہاتھوں میں پختہ کار گھریلو عورت کی پھُرتی تھی۔ اُس کی ماں تو سر باندھے لیٹی رہتی تھی۔ گھر کا سارا کام کاج اس لڑکی نے سنبھال رکھا تھا اور اس حال میں سنبھال رکھا تھا کہ اُسے دونوں بڑے بھائی ذرا ذرا سی بات پر پیٹ ڈالتے تھے اور ماں باپ کی پھٹکار الگ تھی۔

بڑا لڑکا کوئی دو سال بعد مجھے نظر آیا۔ اُس کا حال حلیہ ہی بدلا ہُوا تھا جسم بے ڈھب اور موٹا ہو گیا تھا اور آنکھیں نشے سے چڑھی ہوئیں۔ بہت باتونی ہو گیا تھا۔ جو منہ میں آتا بکتا چلا جاتا تھا۔ معلوم ہُوا کہ وہ پیر کا مریدِ خاص بن گیا ہے لیکن ایک روز ماں باپ کو ننگی گالیاں دے رہا تھا اور سخت غصے میں چلّا چلّا کر کہہ رہا تھا ——"دونوں ٹانگیں توڑ دوں گا۔ قتل کر دوں گا۔ خبردار"

مجھ سے رہا نہ گیا۔ مجھے یہ ڈر محسوس ہونے لگا کہ باپ بوڑھا ہے کہیں یہ چرسی بیٹا مارنے پیٹنے نہ لگے۔ میں اُن کے گھر چلا گیا۔ دیکھا نُور احمد اور اُس کی بیوی ایک ہی چارپائی پر چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ لڑکی شاید کمرے میں تھی اور بیٹا پھنکار رہا تھا۔

میں نے اُسے چُپ کرانے کی کوشش کی تو اُس نے مجھے لمبی چوڑی بات

سُنا ڈالی جس کا لبِّ لباب یہ تھا کہ پیر کی فرمائش کے مطابق نُور احمد نے اپنی بیٹی کو اُس کے ہاں بھیج دیا تھا۔ اُس کا بیٹا وہاں موجود تھا۔ اُس نے اپنی نوجوان بہن کو پیر کے حجرے میں دیکھا تو وہ آگ بگولا ہو گیا اور بہن کو ساتھ گھر لے آیا۔ اُس وقت مجھے معلوم ہُوا کہ لڑکی کل ہمارے ہاں کیوں نہیں آئی۔

نُور احمد کے بیٹے نے کہا کہ وہ کہاں کا پیر ہے جی؟ میں تین سال سے اُس کے ساتھ ہوں۔ وہاں دن رات چرس اور شراب چلتی ہے اور مریدوں کی جوان بیٹیوں اور بیویوں کے ساتھ وہاں جو کچھ ہوتا ہے، وہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور یہ میرے بے غیرت ماں باپ اپنی جوان بیٹی کو وہاں بھیج رہے ہیں۔ میں اس پیر کا ایجنٹ ہوں۔ اُس کی عیاشی کا سامان ہم بہت سے ایجنٹ فراہم کیا کرتے ہیں۔ اس میں سے ہمیں بھی حصّہ ملتا ہے۔

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس بیٹے نے پیر سے قطع تعلق کر لیا تھا یا اُس کا ایجنٹ بنا رہا، اتنا ضرور ہے کہ وہ اب باقاعدہ بدمعاش بن گیا تھا۔ کبھی کبھی گھر آیا کرتا تھا۔ اُس کی بہن ہمارے ہاں روزانہ آتی تھی۔ وہ اب جوان ہو گئی تھی۔ ہم نے کبھی اُسے مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ میری بیٹیاں بعض اوقات اُس سے مذاق کرتی تھیں تو بھی وہ مسکراتی نہیں تھی۔

جنگ ختم ہو گئی تو ایک سال بعد نُور احمد کا بیٹا جو فوج میں بھرتی ہو گیا تھا واپس آ گیا لیکن ایک برمی لڑکی کو ساتھ لے آیا۔ وہ اُس کی بیوی تھی۔ معلوم ہُوا کہ اُس کے پاس خاصا پیسہ تھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ دو تین مہینے ماں باپ کے ساتھ رہا پھر ایک روز بیوی کو لے کے چلا گیا اور آج بیس اکیس سال گذر گئے ہیں، اُس کا کوئی سُراغ نہیں ملا۔

۱۹۴۷ء میں برِصغیر میں انقلاب آیا۔ نُور احمد پر اس انقلاب کا اثر یہ ہُوا کہ دونوں ہندو ساہوکار ہندوستان چلے گئے جس سے اُس کا باقی ماندہ قرضہ ختم ہو گیا اور مکان بھی بچ گیا مگر اُس کا روزگار بھی ختم ہو گیا کیونکہ جس ورکشاپ میں وہ کام کرتا تھا، وہ ہندوؤں کی تھی۔ مسلمان ابھی اس میدان میں نہیں آئے تھے نہ اس میدان کے قابل تھے۔ نور احمد کے گھر میں اب فی الواقع فاقے ہونے لگے۔ بڑا بیٹا

کبھی کبھی گھر آتا تھا اور ماں باپ کو چند روپے دے جاتا تھا۔ بعض اوقات یہ چند روپے دوسرے بیٹے اُڑا لے جاتے تھے۔

نُور احمد کی خوش قسمتی کہ اُس کی بیوی کے جہیز کی سلائی مشین گھر میں محفوظ تھی۔ اُس کی بیٹی نے کچھ اپنی ماں اور کچھ میری بیوی سے سلائی کڑھائی کا کام سکھ لیا اور وہ گھر گھر جا کر سلائی کا کام لانے لگی۔ میں نے اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ گھر میں سلائی کا جس قدر کام ہو وہ اس لڑکی کو دے دیا کرے۔ محلّے کے جن گھرانوں پر میرا کچھ اثر تھا انہیں بھی کہہ دیا کہ اس لڑکی کو امداد کے طور پر ہی سلائی کڑھائی کا کام دے دیا کریں۔ اس طرح اُسے اس قدر کام ملنے لگا کہ رات کے وقت بھی اُس کے گھر سے مشین کی آواز سُنائی دیتی تھی۔ اس مشقّت کے علاوہ وہ ہانڈی روٹی اور گھر کے سارے کام کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے محلّے کی تین چار بچیوں کو قرآن پڑھانے کا کام بھی شروع کر دیا۔ اُس کی ماں تو اب ہلکی سی محنت و مشقت کے بھی قابل نہیں رہی تھی۔ بیٹوں کے غم نے اُسے ادھ مؤا کر دیا تھا۔

نُور احمد کا بڑا بیٹا بھی لاپتہ ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد اُس کے متعلق طرح طرح کی خبریں سُنائی دینے لگیں۔ کوئی کہتا تھا کہ لائل پور جیل میں ہے۔ شاید ڈاکے یا قتل میں پکڑا گیا تھا۔ بعض لوگ وثوق سے کہتے تھے کہ وہ کہیں اپنے جرائم پیشہ ساتھیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے۔ بہرحال وہ ماں باپ کے لیے مر چکا تھا کیونکہ وہ پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ باقی دو بیٹے بھی مکمل طور پر گمراہ ہو چکے تھے جن کے متعلق نُور احمد نے اب یہ کہنا شروع کر دیا کہ پیدا ہی نہ ہوتے تو اچھا تھا۔

پھر محلّے والوں نے یہ منظر بھی دیکھا کہ نُور احمد غموں اور بڑھاپے سے اس قدر معذور ہو گیا کہ ایک روز دروازے سے باہر نکل رہا تھا کہ غش کھا کر گر پڑا۔ چار بیٹوں کا باپ جس نے کبھی کہا تھا کہ لڑکیاں تو بدبختوں کے گھروں میں پیدا ہوتی ہیں، بے بسی کے عالم میں گلی میں اوندھے منہ پڑا تھا اور اُسے اپنی بیٹی اُٹھانے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی اور زار و قطار رو رہی تھی۔ محلّے کے دو چار آدمی پہنچ گئے اور نُور احمد کو اندر اُٹھا لے گئے۔

اس کے بعد میں نے اُس کی بیٹی کو ڈاکٹر کے پاس جاتے دیکھا اور ہر روز

باقاعدگی سے دوائی لاتے دیکھا۔ میں نُور احمد کو دیکھنے جایا کرتا تھا۔ اُس کی بیٹی کو میں اُس کا سر دباتے یا مٹھی چاپی کرتے دیکھا کرتا تھا۔ اُس کے دو بیٹے زندہ تھے لیکن میں نے اُن میں سے ایک کو بھی کبھی باپ کے پاس نہیں دیکھا تھا۔

خدا خدا کر کے نُور احمد کی طبیعت سنبھل گئی لیکن بڑھاپے نے اُسے معذور کر رکھا تھا، پھر بھی اُس نے ایک ورکشاپ میں نوکری کر لی۔ بیٹی نے اُسے کئی بار نوکری سے روکا لیکن وہ جان چکا تھا کہ اب وہ جوان بیٹی کے کندھوں پر بوجھ بن گیا ہے۔ محلّے والے اکثر باتیں کیا کرتے تھے کہ نُور احمد اور اُس کی بیوی بڑھاپا کس طرح گذاریں گے۔ لڑکی شادی کی عمر سے بہت آگے نکلی جا رہی ہے۔ اُس کی شادی ہو گئی تو ماں باپ کا کیا بنے گا؟ یہ گھرانا شادی بیاہ سے تو محروم ہی تھا۔ دو بیٹے لاپتہ ہو چکے تھے اور دو آوارہ۔ کون تھا جو انہیں اپنی بیٹیاں دے دیتا؟ جہاں تک لڑکی کا تعلق تھا، دو تین جگہوں سے اُس کے لیے پیغام آئے تھے لیکن لڑکی نے خود ہی ماں باپ سے کہہ کر پیغام ٹھکرا دیے۔ اس کی ہم عمر لڑکیاں کبھی کی بیاہی جا چکی تھیں۔ خود میری دونوں بیٹیوں کے اولاد بھی ہو چکی تھی لیکن یہ لڑکی ماں باپ کی خدمت میں مگن تھی۔

ایک روز بیوی نے مجھے بتایا کہ لڑکی اب شادی کر لے گی کیونکہ اُس کے تایا کا ایک بیٹا اکثر ان کے گھر آتا ہے۔ میری بیوی نے بتایا کہ اس لڑکے کو دیکھ کر لڑکی کے چہرے پر خوشی سی نظر آنے لگتی ہے۔ لڑکا بھی اس میں دلچسپی لیتا ہے۔ یہ سلسلہ کوئی پانچ چھ مہینے چلا۔ آخر ایک روز پتہ چلا کہ لڑکے کی شادی کسی اور جگہ ہو رہی ہے۔ میری بیٹیوں نے لڑکی سے پوچھا تو اُس نے صاف الفاظ میں بتایا کہ وہ لڑکا اُسی کی خاطر آیا کرتا تھا اور وہ اُسے بہت اچھا لگتا تھا۔ جب اُس نے لڑکی کے ساتھ شادی کی بات کی تو لڑکی نے کہا کہ میں اس وعدے پر شادی کروں گی کہ تم میرے گھر رہو۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی والدین اپنے بیٹے سے اس طرح دستبردار نہیں ہُوا کرتے۔ اس لڑکے کی شادی کسی اور جگہ ہو گئی۔ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ میری بیوی کے کہنے کے مطابق لڑکی کو پہلی بار دلی محبّت ملی تھی، اُس نے وہ بھی ماں باپ پر قربان کر دی۔

نُوراحمد توسوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو بیاہ سکے گا اور اب تو بیاہ کی بات ہی ختم ہوگئی ہے۔ لڑکی (جسے میں اب بھی لڑکی ہی کہوں گا) پچاس برس کی عمر کو پہنچ گئی ہے۔ نُوراحمد چلنے سے بھی معذور ہے۔ نوکری کا سلسلہ کبھی کا ختم ہے۔ ماں الگ پڑی کھانستی رہتی ہے لیکن اُن کی بیٹی دن رات سلائی کڑھائی اور اونی کام کرتی ہے۔ بچّیوں کو قرآن پڑھاتی ہے اور ماں باپ کو صاف ستھرا رکھتی ہے۔ میں اُسے اکثر دیکھا کرتا ہوں۔ میں اُس کے بچپن میں اُس کے معصوم سے چہرے پر جو مُسکراہٹیں ڈھونڈا کرتا تھا اور نہیں ملتی تھیں، وہ اب اُس کے چہرے پر آگئی ہیں۔ اُس کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کا تبسّم بتاتا ہے کہ وہ رُوحانی مسرّتوں سے سرشار ہے۔ اب وہ ہنسی مذاق کی باتیں بھی کرتی ہے۔ محلّے میں ماتم بیاہ پر بھی پہنچتی ہے اور اگر کوئی عورت اُس سے شادی کی بات کر بیٹھے تو وہ کھل کر قہقہہ لگاتی ہے جیسے کسی نے اُسے لطیفہ سُنا ڈالا ہو۔

میری اپنی کمر ٹیڑھی ہوگئی ہے۔ کبھی کبھی نُوراحمد کے پاس جا بیٹھتا ہوں۔ ایک روز وہ سکون کی آہ لے کے کہنے لگا — "خدا کا کتنا کرم ہے کہ میرے گھر لڑکی پیدا ہوئی تھی.....!" اور وہ زاروقطار رونے لگا۔

جب ماں ساس بنی

ساس اور بہُو کے معرکے حق اور باطل کی مسلسل جنگ کی طرح اُس روز سے جاری ہیں جس روز ساس اور بہُو دُنیا میں نازل ہوئی تھیں۔ یہ اُس وقت تک جاری رہیں گے جب تک دونوں میں سے ایک کا وجود ناپید نہیں ہوجاتا۔ میں کبھی بہُو ہُوا کرتی تھی، آج دو بہُوؤں کی ساس ہوں لیکن میرے گھر میں سکون رہتا ہے۔ اس سکون کا باعث یہ نہیں کہ میں کوئی غیر معمولی طور پہ دانا عورت ہوں، بلکہ اصل وجہ زخموں کے وہ بھدّے نشان ہیں جن میں سے ایک میری گردن پر ہے اور دو پیٹھ پر۔ کسی بہُو کی کسی بات پر غصہ آتا ہے تو زخموں کے یہ نشان دیکھ لیتی ہوں۔ غصہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے پھر میں سُلجھے ہُوئے طریقے سے بہُو کو اس کی غلطی کا احساس دلادیتی ہوں۔ میری بدقسمتی یہ تھی کہ خدا نے مجھے چہرہ اور جسم اچھا اور خاوند بھلا مانس دیا۔ میری عادات میں کوئی ہیرپھیر بھی نہیں تھا۔ مجھے وہ وقت یاد آتا ہے جب میری ساس میرا رشتہ مانگنے آیا کرتی تھی۔ رشتہ مانگنے والی تو اور بھی تھیں لیکن مجھے یہ عورت جو بعد میں میری ساس بنی، سب سے زیادہ پسند آتی تھی کیونکہ اس کی باتیں بڑی پیاری ہوتی تھیں اور وہ میرے ساتھ پیار بھی بہت کرتی تھی۔ میری امّی بھی اُس سے متاثر تھی۔ وہ جب آتی تو مجھے اپنے پاس بٹھا کر ایک بازو میرے کندھوں پر یا میری کمر کے گرد لپیٹ کر مجھے اپنے ساتھ لگائے رکھتی اور کبھی مجھے اپنی آغوش میں لے لیتی۔ پیار سے کہا کرتی — "یہ تو میری اپنی بیٹی ہے، معلوم نہیں اس گھر میں کس طرح پیدا ہوگئی ہے"

پیار ہر انسان کی بلکہ ہر جاندار کی کمزوری ہے۔ درندے بھی پیار سے

رام ہو جاتے ہیں۔ میری امّی کے پاس پیار کی کمی تھی۔ وہ تو میرے جہیز کے غم میں
گھلتی رہتی تھیں جو بتا نظر نہیں آتا تھا۔ ہم امیر لوگ نہیں تھے صرف فارغ البالی
تھی مگر بچت نہ ہونے کے برابر۔ جہیز کہاں سے بنتا۔ مجھے تو اپنی ہونے والی ساس
کا پیار اچھا لگتا تھا۔ امّی کا رجحان کچھ ایسا تھا جیسے اُن کی خواہش یہ ہے کہ کوئی پیار
کرے نہ کرے بیٹی کو بغیر جہیز کے بیاہ لے جاتے۔ ہر بیٹی کے ماں باپ کی یہی
تمنا ہوتی ہے جو کبھی پوری ہوتی نہیں دیکھی گئی نہ کسی کی کبھی پوری ہو گی۔ میری
ساس کا رویّہ ایسا تھا جیسے وہ میری ماں کی تمنّا پوری کر دے گی۔ وہ کئی بار کہہ چکی
تھی ــــ "جہیز کے جھنجھٹ میں نہ پڑنا بہن! ہم تو دلوں کے سَودے کیا کرتے ہیں۔"
اُس کے ان الفاظ سے میری امّی کے چہرے پر رونق آجایا کرتی تھی۔
میری ساس کو شاید معلوم تھا کہ میرے ماں باپ مجھے ایسا جہیز نہیں دے سکتے
جس کی نمائش سینہ چوڑا کر کے کی جا سکے۔ اُس نے سوچا ہو گا کہ یہاں سے جہیز تو
زیادہ ملے گا نہیں اس لئے یہی احسان دھر دو کہ جہیز پہ اُس کی توجہ ہی نہیں،
اور وہ دلوں کا سودا کرنا چاہتی ہے۔
میرا سَودا اسی عورت کے ساتھ طے ہو گیا۔ جہیز رسمی سا بنا اور میری
شادی ہو گئی۔ جہیز کے خلاف ہر کوئی باتیں کرتا ہے، لیکن جہیز کے بغیر کوئی کسی
کی بیٹی کو قبول بھی نہیں کرتا۔ لڑکوں والے کہتے ہیں کہ انہیں جہیز کی ضرورت نہیں
مگر اُن کی نظر لڑکی کی بجائے جہیز پہ ہوتی ہے۔ رواج کے مطابق میرے جہیز
کی نمائش کی گئی۔ بعد میں جو باتیں سُنی گئیں وہ یُوں تھیں کہ میرے ماں باپ نے
بیٹی تین کپڑوں میں گھر سے نکال دی ہے۔ یہی لوگ جب مل بیٹھتے ہیں تو جہیز کو
ایک لعنت قرار دیتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ میرے ماں باپ نے یہ جہیز بھی
کتنی مشکل سے بنایا ہو گا۔ حد یہ کہ میری وہی ساس جو مجھے پیار سے اپنے بازوؤں
میں لے کر کہا کرتی تھی کہ ہمیں جہیز کی نہیں "اپنی بیٹی" کی ضرورت ہے اُسی
ساس نے پہلے روز جب عورتیں جہیز دیکھنے آئیں تو بد دلی بلکہ طنز کے لہجے
میں کہا ــــ "کیا دیکھو گی۔ شرمندہ ہونے والی بات ہے۔ اتنا جہیز تو اینٹ گارا
اٹھانے والے مزدور بھی دے دیا کرتے ہیں" ــــ میں دوسرے کمرے میں

بیٹھی سُن رہی تھی۔
میرا دل بُجھ گیا۔ ہمارے معاشرے کی ہر لڑکی کی طرح میری بھی قدر و قیمت
جہیز کے پیمانے سے ناپی جا رہی تھی۔ میں اپنے آپ کو کمتر اور حقیر سمجھنے لگی۔
ساس نے مجھے ازدواجی زندگی کے پہلے ہی سات آٹھ دنوں میں احساس دلا دیا
کہ شادی سے پہلے کا پیار محض فریب تھا اور میں اِس گھر کی نوکرانی بن کے رہوں گی۔
انہی سات آٹھ دنوں میں مجھے یہ بھی پتہ چل گیا کہ میرے دُولہا میاں بہت ہی
سیدھے بلکہ سائیں لوک انسان ہیں۔ چالاک اور ہوشیار تو میں بھی نہیں تھی
لیکن خاوند کا چالاک اور ہوشیار ہونا ضروری ہوتا ہے۔ میرے خاوند کی یہ خُوبی
اُس کے سارے نقائص پر پردہ ڈال لیتی تھی کہ مجھے انہوں نے دل کی گہرائیوں
سے قبول کر لیا تھا۔ میں اتنی محبت سے نا واقف تھی جتنی انہوں نے مجھے دی،
مگر اُن کی یہ خوبی اُن کی ماں اور دو بہنوں کی نظر میں بہت بڑا نقص بن گئی۔ وہ
میرے پاس بیٹھتے تو میری ساس یا کوئی نند انہیں آواز دے کر بُلا لیتی اور بازار
سے کوئی چیز لانے کو یا کسی کام کو بھیج دیتی۔ گھر میں ان کا چھوٹا بھائی موجود تھا
لیکن اُسے اس لئے باہر نہیں بھیجا جاتا تھا کہ "وہ سکول کا کام کر رہا ہے۔ اس
کی پڑھائی میں حرج ہوتا ہے۔"
یہ لڑکا یعنی میرا دیور اُس وقت ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ پہلے روز
ہی وہ میرے اتنا قریب آگیا کہ میں اُسے اپنا سگا بھائی سمجھنے لگی۔ بڑا پیارا بچہ تھا۔
میری ساس اور نندوں کو یہ بھی پسند نہیں تھا کہ وہ میرے پاس بیٹھے اور
میرے ساتھ ہنسے کھیلے۔ میں ناتجربہ کار تھی۔ میں نے ساس اور نندوں کی عادات
کو قبول کرنے یا اُن کے آگے ہتھیار ڈالنے کی بجائے اُن کا مقابلہ شروع کر دیا۔
میں نے کوئی لڑائی جھگڑا تو نہ کیا البتہ اُن کے اُلٹ حرکتیں کرنے لگی مثلاً ساس
میرے خاوند کو بلاتی تو تھوڑی دیر بعد میں اُسے اپنے پاس بلا لیتی۔ میری ساس
میرے دیور کو میرے پاس اُٹھنے بیٹھنے سے روکتی تھی۔ میں اُسے بلا کر کہتی کہ
میرے کمرے میں بیٹھ کر سکول کا کام کرو۔ ساس اور نندیں باورچی خانے میں
برتن وغیرہ اپنی ترتیب سے رکھتی تھیں، میں اپنی ترتیب سے رکھنے لگی۔

میرے اس طرزِ عمل سے گھر میں خاموش سی لڑائی شروع ہوگئی جو برتنوں کرنے یا اِدھر اُدھر رکھنے کی صورت میں لڑائی ہوجاتی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں میری اور ساس کی بول چال بند ہوگئی۔ نندوں کو اپنی بھائی کی شادی کا جو شوق تھا وہ بڑی جلدی ختم ہوگیا تھا۔ اب وہ اپنے بھائی کی دُلہن کو بن بلایا مہمان سمجھنے لگی تھیں۔ اُنہوں نے مجھے یُوں سزا دینی شروع کی کہ گھر کا سارا کام کاج میرے سپرد کر دی گئیں۔ نندیں کبھی سر درد کا اور کبھی کسی اور روگ کا بہانہ کر کے مجھے کہہ دیتیں کہ میں جھاڑو دُوں۔ برتن دھونا میرا فرض بن گیا۔ صرف ایک کام تھا جو ساس مجھے نہیں کرنے دیتی تھی۔ یہ تھا ہانڈی پکانا۔ اُسے غالباً یہ ڈر رہتا تھا کہ میں گھی زیادہ ڈال دوں گی یا بوٹیاں چوری کر کے کھا جاؤں گی۔

ساس کی ذہنیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ ایک بار اُس نے ہانڈی پکاتے پکاتے مجھے کہا کہ ذرا ہانڈی دیکھنا۔ وہ خود چھت پر چلی گئی۔ میں نے باورچی خانے میں جاتے ہی بو سُونگھ لی۔ گوشت لگ گیا تھا۔ میں نے ہانڈی اُتار کر دیکھا۔ گوشت جل رہا تھا۔ میں بوٹیاں دیکھ رہی تھی کہ ساس آگئی اور بولی — "ہائے، تُو نے ہانڈی جلا دی ہے؟" — میں نے اُسے بتایا کہ میں نے نہیں بلکہ وہ خود جلا گئی ہے۔ ساس نے دھیمی دھیمی آواز میں مجھے کوسنا شروع کر دیا۔ ہُوا یُوں تھا کہ ہانڈی اُس سے خود ہی جل گئی تھی جو اُس نے مجھے بتائے بغیر میرے حوالے کی اور خود اُوپر چلی گئی۔ ایسی حرکتیں اُس نے ایک بار نہیں کئی بار کیں۔ بعض اوقات روٹیاں پکاتے ایک دو روٹیاں ذرا جل سی جاتی ہیں۔ گھروں میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ ایک بار میری ساس نے میرے خاوند کے آگے کھانا رکھا تو دو جلی ہوئی روٹیاں رکھ کر کہا — "جیسا پکا سکتی ہے ویسا ہی کھا لو۔ کبھی ہانڈی جلا دیتی ہے کبھی روٹیاں۔"

یہ تو میں نے سُن لیا تھا جس سے میں جان گئی کہ وہ میرے خاوند کے کان بھرتی رہتی ہے۔ خاوند میرا سیدھا آدھی تھا۔ کچھ عرصے بعد اُس نے عجز و انکسار سے مجھے بتانا شروع کر دیا کہ اُس کی ماں کو میرے خلاف یہ شکایت

ہے۔ وہ ماں کو سچا سمجھتا تھا لیکن میں اُسے بتاتی کہ یہ شکایت بالکل غلط ہے اور اصل بات کیا ہے تو وہ ماں کو جھوٹا اور مجھے سچا سمجھنے لگتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شکائتیں بڑھتی گئیں۔ خاوند کو ماں اور بہنیں کچھ بتاتیں، میں کچھ اور بتاتی۔ اُس نے تنگ آکر یہ رویّہ اختیار کر لیا کہ دونوں فریقوں کی شکائتیں اور باتیں سُن کر اور دونوں کو سچا کہہ کر اپنی جان چھڑا لیتا۔ اس سے اُس کی ماں کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ تسلی اسی صورت میں ہوسکتی تھی کہ وہ مجھے ڈانٹتا، بُرا بھلا کہتا، مارتا پیٹتا یا گالیاں دیتا۔ وہ کچھ بھی نہیں کرتا تھا۔ میں اس کے اثرات دیکھ رہی تھی۔ میرا خاوند گھبتا جا رہا تھا۔ وہ مجھ سے توقع رکھتا تھا کہ میں اُس کے ساتھ جلی کٹی باتیں نہ کیا کروں۔ میں اُس کی توقع پوری کر دیا کرتی تھی لیکن میں نے ایسی کوشش کبھی نہیں کی تھی کہ ساس اور نندوں کو شکایت کا موقع نہ ملے، بلکہ میں انہیں جلانے کے لئے شکایت کا موقع دیا کرتی تھی۔

ہمارے گھرانوں اور محلوں میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ تین چار گھروں کی عورتیں مل بیٹھتی ہیں تو اپنے اپنے مسئلوں کا رونا روتی ہیں۔ یہ مسئلے یہی کچھ ہوتے ہیں کہ کسی کو بہو سے شکایت ہے، کسی کو خاوند یا بیٹوں سے اور کوئی سسرال سے نالاں ہوتا ہے۔ ہر عورت اپنی اپنی سناتی ہے اور وہ ایک دوسرے کی تائید کرتی ہیں تاکہ اُن کی شکایتوں کو کوئی غلط نہ کہے۔ صلح و صفائی کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ عورتوں کی یہ محفل جب برخاست ہوتی ہے تو تمام عورتیں بھڑکی ہوتی ہیں۔ وہ ایک دوسری کی جلتی پر تیل ڈال چکی ہوتی ہیں۔ پھر یہی عورتیں باری باری اُن کے پاس جا بیٹھتی ہیں جن کے خلاف محفل میں شکائتیں اور باتیں ہوتی تھیں۔ مثلاً کسی ساس نے اپنی بہو کے خلاف باتیں کیں تو وہ بہو کے کان میں جا ڈالیں گی اور بہو کی سُنیں گی۔ یہ باتیں وہ اُس کی ساس کو سنائیں گی اور اس ضمن میں اپنی بہو کے خلاف زہر اُگلیں گی۔

چار دیواری کی دُنیا کی رونق اسی طرح قائم رہتی ہے۔ میں بھی اس رونق کی زد میں آئی ہوئی تھی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ میرے گھر میں عورتیں آتی

تھیں تو میری ساس انہیں الگ بٹھا کر کانا پھوسی کرتی تھی۔ یہ میرے خلاف پروپیگنڈہ ہوتا رہتا تھا جو ایک آدھ دن میں میرے کانوں تک پہنچ جاتا تھا۔ اسی دوران میری ایک نند کی شادی ہوئی۔ میرے والدین نے اپنی حیثیت کے مطابق دیا مگر میری ساس نے انہیں اور مجھے ہر جگہ ذلیل و رسوا کیا۔ کہتی تھی کہ انہوں نے بہت تھوڑا دیا ہے۔ یہ باتیں میری ماں تک پہنچیں تو کھچاؤ بڑھ گیا۔ سسرال میں میرا جینا محال ہو گیا۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہمارے گھروں میں کیا ہوتا ہے۔ آپ کے گھروں میں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ میں آپ کو کچھ اور سنانا چاہتی ہوں۔ میں نے بات اپنی گردن اور پیٹھ کے زخموں سے شروع کی تھی۔ آپ کو بتا چکی ہوں کہ میرا دیور میری شادی کے وقت ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ میرے ساتھ بہت گھل مل گیا تھا جب ساس اور نندوں نے میرے خلاف باقاعدہ مورچے باندھ لئے اور میرے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا تو یہ لڑکا مجھ سے کھچنے لگا، پھر اس کے رویّے سے صاف پتہ چلنے لگا کہ اس کے دل میں میرے خلاف حقارت پیدا ہو گئی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا رویّہ کیوں بدل گیا ہے۔ اس کی ماں اور بڑی بہنیں جب اڑوس پڑوس کی عورتوں کے ساتھ میرے خلاف باتیں کر رہی ہوتی تھیں، یہ لڑکا ان میں بیٹھا ہوتا تھا۔ وہ آخر اس کی ماں اور بہنیں تھیں۔ اس کے دل میں انہی کا درد تھا۔ وہ بچّہ تھا۔ قدرتی طور پر وہ اپنی ماں اور بہنوں کو مظلوم اور مجھے ظالم سمجھنے لگا۔

تھوڑے ہی عرصے بعد اُس نے اس قسم کی حرکتیں شروع کر دیں کہ میرے کمرے کی چیزیں اُلٹ پلٹ کر جاتا۔ ایک بار میں نے اُسے روکا تو اُس نے کہا ــــ "تم میری ماں کو تنگ کرتی ہو، میں تمہیں تنگ کیا کروں گا" ــــ اُس کی ایسی حرکتیں جب ناقابلِ برداشت ہو گئیں تو ایک روز میں نے اپنے خاوند سے شکایت کی۔ خاوند نے اُسے بلا کر پوچھا تو اُس نے اپنے بڑے بھائی کا بھی احترام نہ کیا۔ میرے خاوند نے اُسے ایک تھپّڑ مارا۔ اس کے نتیجے میں گھر میں اودھم مچ گیا۔ ساس اور نندیں میدان میں اُتر آئیں اور میرے

خلاف واہی تباہی بکنے لگیں۔ انہوں نے یہ بھی لحاظ نہ کیا کہ میرا خاوند اُن کا اپنا بیٹا اور بھائی ہے اور وہ اپنے چھوٹے بھائی کو بدتمیزی سے روکنے کا حق رکھتا ہے۔ بہرحال انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ میں نے دیور کو بیگناہ پٹوایا ہے۔ میرا دیور بھی اپنی ماں اور بہنوں کے ساتھ مجھے کوس رہا تھا۔

اس کے بعد اس لڑکے کی بدتمیزی بڑھتی چلی گئی۔ مجھے اکثر حکم دیا کرتا ــــ "او تے، اُٹھ مجھے روٹی دے" ــــ ایک بار میں نے اُسے بازو سے پکڑ کر کمرے سے باہر کر دیا۔ پھر وہی ہنگامہ بپا ہوا۔ نفرت کی خلیج اور زیادہ پھیل گئی۔ میرے اور سسرال کے درمیان کوئی ایسا تنازعہ نہیں تھا جو خونی دشمنی پیدا کرتا۔ کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ کسی بھی ساس اور بہو کے درمیان ایسا کوئی تنازعہ نہیں ہوتا جو طے نہ ہو سکے اور نوبت لڑائی جھگڑے تک پہنچے۔ محض وہم ہوتے ہیں جو حقیقی روپ میں نظر آنے لگتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ماں سمجھتی ہے کہ اُس کے بیٹے پر ایک غیر لڑکی نے قبضہ کر لیا ہے، اور "غیر لڑکی" سمجھتی ہے کہ ماں اُس کے سہاگ پر آسیب بن کر چھا گئی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ جو بیویاں اپنے خاوندوں کو اُن کی ماؤں کے حوالے کئے رکھتی ہیں وہ مائیں بھی بہوؤں کی دشمن بنی رہتی ہیں۔ اس کا نتیجہ ایک تو یہ ہوتا ہے کہ گھر کا سکون برباد رہتا ہے۔ دوسرا یہ کہ بچّوں پر اس کا بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس کا نتیجہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ میرے معاملے میں ہُوا۔ میرا دیور اپنی ماں اور بڑی بہنوں کے اثرات قبول کرتا گیا۔ ماں اور بہنوں کو اسی سے خوشی ہوتی تھی کہ وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے اور میری بے عزتی بھی کر دیا کرتا ہے۔ اُس کے رویّے میں اُس کی ماں اور بہنوں کی حوصلہ افزائی بھی شامل تھی۔

میرا ایک بچّہ پیدا ہُوا۔ مَیں، میرا بچّہ اور بچے کا باپ ایک کنبہ بن گئے۔ میری خواہش تھی کہ اب ہم الگ رہیں لیکن ساس کا آسیب پہلے سے زیادہ شدید ہو گیا۔ میں نے خاوند کے سامنے کبھی بھی اس خواہش کا اظہار نہ کیا کہ ہمیں الگ رہنا چاہیئے۔ میں انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ان کی طرف سے مجھے کوئی شکایت نہیں تھی بلکہ مجھے یوں کہنا چاہیئے کہ سسرال کے جہنم میں

وہی میری پناہ تھے۔ وہ سرکاری ملازم تھے۔ میں یہ دعائیں ضرور مانگا کرتی تھی کہ ان کا تبادلہ کہیں اور ہو جائے مگر یہ دعا قبول ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔

میرے دیور نے میٹرک پاس کر لی۔ اور میرا بچّہ دو سال کا ہو گیا۔ گھر میں کشیدگی شدید ہو چکی تھی۔ میری ساس کو جیسے اس کشیدگی اور تلخی میں مزہ آتا تھا۔ میری دوسری نند کی بھی شادی ہو گئی۔ دونوں نندوں کی غیر حاضری سے گھر کے ماحول میں ذرا سی بھی خوشگوار تبدیلی نہ آئی۔ ساس نے ان دونوں کی کمی اکیلے پوری کئے رکھی۔ پہلی نند اپنے سسرال میں پرانی ہو چکی تھی اور وہ جب گھر آتی تو اپنی ساس کے خلاف وہی شکائتیں کرتی جو اُس کی ماں کے خلاف مجھے تھیں۔ اُس کی ایک نند بھی تھی۔ وہ بھی اُسے اسی طرح پریشان رکھتی تھی جس طرح اُس نے مجھے تنگ کئے رکھا تھا مگر اُس کی ماں نے اور اُس نے خود بھی میرے ساتھ روّیے میں اچھی تبدیلی پیدا نہ کی۔

ایک روز میرے خاوند نے مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ اُس کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ تبادلہ ضلعے میں ہُوا تھا۔ اس پر بھی ہنگامہ ہُوا۔ یہ الزام مجھ پر عائد کیا گیا کہ میں نے خاوند کو تبادلہ کرانے پر مجبور کیا تھا۔ خاوند نے انہیں بتایا کہ تبادلہ کرایا نہیں گیا بلکہ کیا گیا ہے۔ خاوند نئی جگہ چلا گیا۔ اُس کی غیر حاضری میں مجھے ساس کی گھُرکیاں اور طعنے سہنے پڑے۔ میرا دیور میرا دشمن بن چکا تھا۔ اس کے لئے نوکری ڈھونڈی جا رہی تھی۔ آگے پڑھانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ تعلیم میں دلچسپی لینے والا لڑکا تھا ہی نہیں۔ تعلیم سے فارغ ہو کر وہ پورا پورا دن گھر سے غائب رہتا۔ صرف کھانے کے لئے گھر آتا تھا۔ باہر سے اُس کی رپورٹیں اچھی نہیں تھیں۔ دو بار باپ نے اُسے مارا پیٹا۔ میں بھی دیکھ رہی تھی کہ وہ آوارہ ہوتا جا رہا تھا۔

ایک مہینہ بڑی مشکل سے گزارا۔ خاوند آیا اور مجھے لے گیا۔ کرائے کا مکان مل گیا تھا۔ ازدواجی زندگی میں پہلی بار سکون میسّر آیا۔ میں خوشی خوشی اپنا گھر بنانے میں مگن ہو گئی۔ خاوند نے مجھے بتایا کہ تبادلہ اُس نے خود بڑی بھاگ دوڑ سے کرایا تھا۔ وہ اپنے گھر کے حالات سے بہت تنگ تھے۔ انہوں نے یہی

علاج سوچا کہ کہیں تبادلہ کرا لیا جائے۔ انہوں نے کرا لیا۔ ساس کے خطوط آنے لگے۔ ہر خط میں مالی تنگ دستی کا رونا ہوتا تھا۔ ساس کا مطلب یہ تھا کہ میرا خاوند تنخواہ کا زیادہ تر حصّہ گھر بھیج دیا کرے۔ انہوں نے ایسا نہ کیا۔ تنخواہ کا تیسرا حصّہ بھیجا کرتے تھے۔ اس دوران یہ خبر ملی کہ میرا دیور کسی ٹھیکیدار کے پاس مُنشی لگ گیا ہے۔ تنخواہ ایک سو روپیہ تھی جو اُس دَور میں معقول تنخواہ سمجھی جاتی تھی، مگر اُس نے صرف ایک مہینہ نوکری کی، پھر چھوڑ کر آوارہ پھرنے لگا۔ اُسے دراصل آوارگی کا چسکا پڑ گیا تھا۔

تین چار مہینوں بعد ماں باپ نے اُسے ہمارے پاس بھیج دیا۔ میرے خاوند کو یہ فرض سونپا گیا کہ بھائی کو سنبھالے اور اسے کہیں نوکر کرا دے۔ وہ جب میرے پاس آیا تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دن دُگنا رات چوگنا جوان ہوتا جا رہا ہو۔ وہ گٹھا ہُوا جوان بن چکا تھا۔ میں نے اُسے وہی پیار دینا چاہا جو اُسے اُس وقت دیا تھا جب وہ ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا مگر میں نے دیکھا کہ اُس کے دل میں وہ نفرت جو اُس کی ماں اور بہنوں نے پیدا کی تھی وہ پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی۔ میرے خاوند نے اُس سے پوچھا کہ اُس نے ٹھیکیدار کی نوکری کیوں چھوڑی ہے؟ اُس نے اتنا ہی جواب دیا کہ وہ نوکری میری پسند کی نہیں تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ اگر نوکری کرنی ہے تو پسند اور ناپسند کا سوال پیدا نہیں ہونا چاہئے، نوکری تو کرنی ہی پڑے گی۔ اس نے جواب دیا — "مجھے کوئی کہے کہ میں تمہاری نوکری کر لوں تو وہ میں ایک ہزار روپیہ ماہوار پر بھی نہیں کروں گا۔"

"اپنے بھائیوں کو کوئی نوکر رکھا کرتا ہے؟" — میں نے بڑے پیار سے کہا۔

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اُس کے چہرے پر نفرت کے آثار دیکھے۔ مجھے غصّہ آ گیا۔ آج جب میں خود اس جیسے جوان بیٹوں کی ماں بن چکی ہُوں اور زندگی کا فلسفہ کتابیں پڑھے بغیر سمجھ گئی ہوں، میں سوچا کرتی ہوں کہ گھروں کی ذرا ذرا سی کشیدگی اور ایک دوسرے کے خلاف من گھڑت شکائتیں بچّوں پر کیسے

کیسے اثرات نقش کر دیتی ہیں۔ میرے دیور نے بارہ تیرہ سال کی عمر میں میرے خلاف نفرت اپنے دل میں بٹھائی تھی جس کی ذمہ داری اُس کی ماں اور بہنوں پہ عائد ہوتی ہے۔ اب اُس کی عمر اٹھارہ سال ہو گئی تھی۔ اب وہ غالباً یہ سمجھ چکا تھا کہ اس کے بڑے بھائی کو میں نے اُس کے ماں باپ سے جُدا کیا ہے۔ ماں اور بہنوں نے یہی اُس کے دماغ میں ڈالا تھا کہ اُس کے بھائی کو میں جیسے اغوا کر کے لے آئی ہوں۔ اُس نے ایسا اظہار کر بھی دیا تھا۔ وہ اس طرح کہ میں اُسے ایک روز سمجھا رہی تھی کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرے پھر میں اس کی شادی کراؤں گی۔

"مجھے اپنے خاوند کی طرح نہ سمجھو"___ اُس نے طنزیہ لہجے میں کہا ___"میں تمہارے جال میں نہیں آؤں گا"۔

میرے خاوند نے اُس کے لئے نوکری کی تلاش شروع کر دی اور میرا دیور یہاں بھی آوارہ گردی کرنے لگا۔ اُس نے محلّے میں اپنے جیسے دوست بنا لیے۔ میرے خاوند نے مجھے بتایا کہ اس لڑکے نے بیہودہ قسم کے لڑکوں کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا ہے۔ ایک روز خاوند نے اُسے ان لڑکوں سے دُور رہنے کو کہا تو وہ خاموش رہا___ خاوند کی غیر حاضری میں اُس نے مجھے کہا کہ میں اُس کے بڑے بھائی کو اُس کے خلاف اُکسا رہی ہوں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اُس کے دل سے اپنی دشمنی دُور کر سکوں مگر میں کامیاب نہ ہو سکی۔

اُس کے لئے ایک نوکری مل گئی مگر یہ بھی اُس نے ایک ہی مہینہ کی اور یہ کہہ کر چھوڑ دی کہ اُسے پسند نہیں۔ اس کے بعد اُس کی ماں ہمارے ہاں آئی۔ میں نے دیور کو اپنا بھائی سمجھ کر ساس کو بتایا کہ اس کی عادتیں بگڑ گئی ہیں اور میں اسے راہِ راست پہ لانے اور اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

"تم تو اس کے پاؤں اکھاڑ رہی ہو"___ ساس نے کہا ___"تمہیں تو صرف اپنا خصم چاہیئے۔ کہتی ہو کہ تمہارے گھر میں اور کوئی قدم ہی نہ رکھے"۔

اس کے بعد ساس نے اپنے آوارہ بیٹے کی حمایت میں مجھے دل کھول کر جلی

کٹی سنائیں۔ میرا خاوند اور دیور گھر نہیں تھے۔ شام کو ساس اپنے دو بیٹوں کو کمرے میں لے گئی اور ان کے کان بھرے۔ میرے خاوند نے تو پریشان ہونے کے سوا کوئی اثر قبول نہ کیا مگر میرے دیور کا ردِ عمل ناقابلِ برداشت تھا۔ ماں نے اس میں بارود بھر دیا تھا۔ وہ گھر میں پھنکارتا پھرتا تھا۔ اُس کی ماں دو تین روز بعد چلی گئی لیکن میرے گھر میں اپنا آسیب چھوڑ گئی۔ اس کے چند ہی روز بعد کا واقعہ ہے کہ میری ایک پڑوسن آئی۔ اُس نے میرے دیور کے خلاف یہ شکایت کی کہ اُس نے اس کے گھر سے دس روپے کا نوٹ چوری کر لیا ہے۔ میرا دیور اس عورت کے بیٹے کے ساتھ اُس کے گھر آتا جاتا تھا۔ وہاں کہیں دس روپے کا نوٹ پڑا تھا جو میرے دیور نے اُٹھا لیا۔ اس کے دوست نے یقین سے کہا کہ نوٹ اسی نے اُٹھایا ہے۔ دونوں دوستوں کا آپس میں لڑائی جھگڑا بھی ہوا۔

دیور گھر آیا تو میں اُس پر برس پڑی۔ میں اپنے گھر کی یہ بے عزتی برداشت نہ کر سکی کہ ہم پر چوری کا الزام عائد کیا جاتے۔ میں دیور کے خلاف پہلے ہی بھری پڑی تھی۔ میرے اندر جتنا غبار جمع تھا وہ اس پر نکال دیا۔ اس نے مجھے غنڈوں کی طرح دھمکی دی ___"زبان کو لگام دو، ورنہ تمہارا خون کر دوں گا۔ تم بدمعاش عورت ہو"___ میں نے اس کے جواب میں اُس کی ماں کو اور اُس کی بہنوں کو بدمعاش اور بدچلن کہا۔ میں کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دانشمند نہیں تھی۔ میں بھی تو انہی لوگوں میں سے تھی۔ دیور نے مجھے گالیاں دیں میں اور زیادہ چیخنے لگی۔ پڑوسنیں آگئیں۔ وہ میرے دیور کو جانتی تھیں کہ کس قماش کا ہے۔ انہوں نے اسے خوب ڈانٹا جھڑکا۔

اتنے میں میرا خاوند دفتر سے آگیا۔ گھر کا حال احوال دیکھ کر گھبرا گیا۔ میں نے غصّے کے عالم میں اُسے بتایا کہ اس کے چھوٹے بھائی نے فلاں گھر سے دس روپے چُرائے ہیں۔ میں نے پوچھا تو مجھے کہتا ہے کہ تم بدمعاش عورت ہو، تمہارا خون کر دوں گا۔ جس عورت کے گھر سے روپے چوری ہوئے تھے وہ بھی میرے گھر میں موجود تھی۔ اُس نے چوری کی تصدیق کی تھی۔ باقی جو عورتیں میرے گھر میں جمع ہو گئی تھیں انہوں نے میرے دیور کے خلاف باتیں کیں۔ میرا خاوند بہت

سیدھا اور بھلا مانس آدمی تھا مگر اُس کی برداشت کی حد ختم ہو چکی تھی۔ اُس نے اپنے بھائی کو پیٹنا شروع کر دیا۔ اُسے بہت پیٹا اور وہ بار بار کہتا تھا —— "اتنے عرصے سے تمہاری ماں کی بکواس برداشت کر رہا ہوں۔ وہاں سے بھاگ آیا تو بھی تم نے میرا پیچھا نہ چھوڑا" —— بڑی مشکل سے اُسے چھڑایا۔ محلّے میں ہم تماشہ بن گئے۔ میرا دیور باہر نکل گیا۔

وہ رات کو بھی نہ آیا۔ میں نے اپنے خاوند سے کہا کہ اُسے کہیں تلاش کرے مگر میرا خاوند غصّے سے بے حال ہوا جا رہا تھا۔ کہتا تھا کہ وہ واپس آ گیا تو بھی وہ اُسے گھر میں نہیں رہنے دے گا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ دیور اپنے گھر چلا گیا ہو گا اور اُس کی ماں اور باپ آئیں گے، پھر میری شامت آ جائے گی میرا سسر اپنی بیوی کا غلام تھا۔ میں گھر میں ایک اور لڑائی کا خدشہ محسوس کرنے لگی۔ زیادہ ڈر یہ تھا کہ میرا خاوند بہت ہی بھڑک اُٹھا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی بے عزّتی کرنے پر تلا ہوا تھا۔ میں اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی رہی مگر ناکام رہی۔ مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ اُس جیسا خاموش طبع اور سیدھا سادا آدمی یوں بم کی طرح پھٹے گا۔

رات گزر گئی۔ میرا دیور نہ آیا۔ میرا خاوند تیار ہو کر دفتر چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد میرے گھر کے صحن کا دروازہ کھلا۔ میں باورچی خانے میں تھی۔ تیز تیز قدموں کی آواز آئی۔ میں دیکھنے ہی لگی تھی کہ کون آ رہا ہے کہ میرا دیور باورچی خانے میں آ گیا۔ میں نے دیکھ لیا کہ اُس کے ہاتھ میں چاقو ہے۔ اُس نے گالی دے کر مجھ پر حملہ کیا۔ اُس کا چاقو میری گردن کے دائیں طرف کان کے نیچے لگا۔ میں سر بچا گئی تھی جس سے چاقو ترچھا لگا۔ نوک کی طرف سے گردن کے اندر نہ گیا۔ میں نے چیخ ماری، شور مچایا اور چھری اُٹھانے کو جھکی۔ اُس نے میری پیٹھ میں چاقو مارا۔ چھری میرے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ میں نے جھکے جھکے اُس کی ران میں چھری ماری۔ وہ باورچی خانے سے نکلا۔ میں شور بھی مچا رہی تھی۔ اُس نے چاقو کا ایک اور وار کیا جو میری پیٹھ پر پڑا۔ میں نے چھری سے اُس پر حملہ کیا۔ وہ بچ گیا۔ وہ بھاگنے سے پہلے مجھے قتل کرنا چاہتا تھا لیکن میری چھری سے ڈرتا بھی تھا۔

دروازے میں دو آدمی اندر آئے۔ اُن کے پیچھے دو تین عورتیں آئیں۔ وہ میرا شور سُن کر آئے تھے۔ میرا دیور چاقو لہراتا دروازے کی طرف بھاگا۔ اندر آنے والوں نے اُسے راستہ دے دیا۔ مجھ پر دہشت طاری تھی۔ خون بھی بہہ رہا تھا۔ مجھ پر غشی طاری ہونے لگی۔ میں نے آخری الفاظ یہ سُنے —— "پکڑ لیا ہے" —— پھر میں بے ہوش ہو گئی۔ ہوش میں آئی تو میں ہسپتال میں بستر پر پڑی تھی۔ بستر پر میرا خاوند بیٹھا تھا۔ بنچ پر ایک تھانیدار اور ایک سپاہی بیٹھے ہوئے تھے۔ تھانیدار نے مجھ سے حال پوچھا۔ میں خاوند کو دیکھ کر رو پڑی۔ انہوں نے مجھے تسلّی دی۔ بہت حوصلہ دیا۔ تھانیدار یہ کہہ کر چلا گیا کہ ڈاکٹر کو لے آؤں۔ میں ہوش میں آ چکی تھی۔

ڈاکٹر نے آ کر مجھے اچھی طرح دیکھا اور پوچھا کہ میں بیان دے سکوں گی یا نہیں۔ میں نے خاوند کی طرف دیکھا۔ میں اُن سے پوچھنا چاہتی تھی کہ ان کے بھائی کے خلاف بیان دُوں یا نہ دُوں۔ انہوں نے کہا کہ میں تھانیدار کو ساری بات سنا دوں۔ میں تھوڑا سا بولی تو میرا سانس پھول گیا۔ ڈاکٹر نے بولنے سے روک دیا۔ پولیس چلی گئی۔ خاوند نے مجھے بتایا کہ میرے دیور کو محلے کے دو آدمیوں نے پکڑ لیا تھا۔ وہ میری چھری سے زخمی تھا اس لئے اُسے بھی ہسپتال میں لایا گیا تھا۔ زخم گہرا نہیں تھا۔ مرہم پٹی کے بعد اُسے حوالات میں بند کر دیا گیا تھا۔ مجھے تازہ خون دیا گیا۔ مجھ پر دہشت کا زیادہ اثر تھا۔ ماں اور بہنوں نے اپنے بیٹے کو درندہ بنا دیا تھا۔ یہ تو میری کچھ اور زندگی لکھی تھی ورنہ وہ تو مجھے قتل کرنے آیا تھا۔

دوسرے دن میں بیان دینے کے قابل ہو گئی۔ اتنی زیادہ مہلت مل جانے سے میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ دیور کو بچانے کی کوشش کروں گی۔ میرا خاوند کہتا تھا کہ اسے پھانسی مل جائے تو اچھا ہے۔ یہ ان کے غصّے کا اظہار تھا۔ میں تھانیدار کو بیان دے رہی تھی۔ اُس نے محسوس کر لیا کہ میں دیور کو بچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اُس نے قلم روک لیا اور کہنے لگا —— "تم جانتی ہو اس نے کیا بیان دیا ہے؟ اُس نے رات کو بیان میں کہا ہے کہ میری بھابی بدکار

ہے۔ میں اُسے بدکاری سے روکتا تھا اور وہ باز نہیں آتی تھی۔ میں نے تنگ آکر اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا۔"

میں جل اُٹھی۔ میرا خاوند مجھ سے زیادہ بھڑکا۔ انہوں نے تھانیدار سے پوچھا، ان کے بھائی نے کسی آدمی کا نام لیا ہے؟ تھانیدار نے ہنس کر کہا — "مجھے ایسا بُدھو نہ سمجھو کہ کسی ملزم نے جو بیان دیا میں نے اسی پر اعتبار کر لیا۔ میں تمہارے محلے والوں اور پڑوسیوں سے تصدیق کرا چکا ہوں۔ تمہاری بیوی کی شرافت کی تعریف سب نے کی ہے اور سب نے بتایا ہے کہ تمہارا بھائی بدمعاش اور نکھٹو ہے"۔ تھانیدار نے مجھے ایک ایسی بات کہی جس سے میں کانپ گئی۔ اُس نے مجھے کہا — "تم اپنے بیان میں یہ کہو کہ ملزم نے میرے خاوند کی غیر حاضری میں میری عزت پر حملہ کیا تھا۔ میں نے اس سے بچنے کی کوشش کی اور شور مچایا تو اس نے مجھ پر چاقو سے حملہ کیا اور میں نے چھُری سے اپنا دفاع کیا۔"

میں نے ایسا بیان دینے سے صاف انکار کر دیا۔ تھانیدار نے مجھے یہ کہہ کر ڈرایا کہ میرا دیور عدالت میں یہ بیان دے گا کہ تمہارا چال چلن ٹھیک نہیں تھا، پھر اس کا وکیل بڑی ہی بیہودہ اور لغو جرح کرے گا، اس لئے مجھے کیس مضبوط کرنے کے لئے یہ کہنا چاہیئے کہ دیور نے میری عزت پر حملہ کیا تھا۔ میں نے ایسا بیان نہ دیا۔ تھانیدار دراصل ہندو تھا۔ وہ شاید مسلمان گھرانے کو پوری طرح ذلیل کرنا اور مسلمان ملزم کو سزا دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اصل واقعہ سُنا دیا۔

دو تین روز بعد میری ساس اور سُسر آگئے۔ ان کے ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ وہ ہسپتال مجھے دیکھنے آتے تو میں نے ساس سے صاف کہہ دیا کہ یہ سب اُس کی شہ کا نتیجہ ہے۔ اُسی نے اپنے بیٹے کے دل میں نفرت بھری تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ جوابی حملہ کرے گی لیکن اُس کے آنسو بہہ رہے تھے اور زبان بند تھی۔ اُس نے جب زبان کھولی تو بڑی اچھی باتیں کر رہی تھی۔ اُس نے اور سُسر نے مجھے قائل کرنا شروع کر دیا کہ میں ان کے بیٹے کو بخش دوں اور وہ پولیس سے مل کر راضی نامے کی کوشش کریں گے۔ میں بھی چاہتی تھی مگر میرے والدین

بھی میرے خاوند کی اطلاع پر آگئے۔ انہوں نے کہا، کہ راضی نامہ نہیں کیا جائے گا۔ میرا چھوٹا بھائی جوان تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اپنی بہن کی بے عزتی کا بدلہ لوں گا۔ میں نے اپنے خاوند سے پوچھا تو وہ میرے والدین اور بھائی کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔ اس نے کہا — "میرے لئے بھائی مر گیا ہے۔"

ہندو تھانیدار پہلے ہی راضی نامے کے حق میں نہیں تھا۔ کیس کورٹ میں چلا گیا۔ میرے دیور نے میرے چال چلن کو بُرا کہا مگر کسی آدمی کا نام نہ لیا۔ اس کے وکیل نے مجھ پر بہت ہی بیہودہ جرح کی۔ میرے ہوش اُڑ رہے تھے۔ لوگ کہا کرتے ہیں کہ اپنی بیٹی کو کچہری چڑھانے سے مر جانا بہتر ہے، مگر یہاں بیٹی ایسی کچہری چڑھی کہ اپنے خاوند کے بھائی نے اُسے بھری عدالت میں ننگا کر دیا۔ وہ میرے خلاف کچھ بھی ثابت نہ کر سکا۔ آخر اُسے قاتلانہ حملے میں پانچ سال سزائے قید دی گئی۔ اپیل بھی خارج ہو گئی۔ مجھے اس کی نہ اُس وقت خوشی ہوتی تھی نہ آج ہے۔ میں دیور کو بے گناہ سمجھتی ہوں۔ اصل مجرم اُس کی ماں اور بہنیں تھیں جنہوں نے اُسے بارہ تیرہ سال کی عمر میں پاس بٹھا کر محلے کی عورتوں کے ساتھ میرے خلاف بے بنیاد باتیں کیں اور اس کے دل میں میرے خلاف نفرت پیدا کی۔

اس کے بعد ہم الگ تھلگ رہے۔ خاوند مجھے کبھی بھی اپنے ماں باپ کے گھر نہیں لے گیا۔ ان کا بھائی جیل خانے سے آکر پکا غنڈہ اور چرسی بنا اور اس کی زندگی دس بارہ سال بعد چرس نے ختم کر دی۔ پھر میرے سُسر اور ساس بھی دُنیا سے اُٹھ گئے۔ آج میں دو بہوؤں کی ساس ہوں۔ دونوں بیٹوں کو بہوؤں کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ انہی کی ملکیت ہیں۔ کبھی ان کے خلاف کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے تو اپنی گردن اور پیٹھ کے زخموں کے نشان دیکھ لیتی ہوں اور شکایت بیٹوں اور بہوؤں کے سامنے کرتی ہوں۔ گھر میں سکون ہی سکون ہے۔

جب تصوّروں کے قلعے مسمار ہوئے

چار دیواری کی دُنیا کی کہانیاں شروع سے پڑھ رہی ہوں۔ سُنانے والوں اور سُنانے والیوں نے بے باکی سے وہ راز بھی بے نقاب کر دیتے ہیں جو دراصل کھلی حقیقتیں ہیں لیکن ہر گھرانہ انہیں چھپانے کی ایسی ہی کوشش کرتا ہے جیسے کوئی برہنہ عورت باریک دوپٹے سے اپنے جسم کو ڈھانپنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ایک راز ایسا ہے جو ابھی آپ کے پاس نہیں پہنچایا گیا۔ اگر پہنچایا گیا ہے تو آپ نے اسے رسالے یا کتاب کے صفحوں کے حوالے کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو گھر اُجاڑ رہی ہے۔ اگر گھر نہیں اُجڑتے تو اس کے دوسرے نتائج اُجڑنے سے زیادہ بھیانک ہیں۔

مَیں آپ کو اپنی اور اپنی سہیلیوں کی بات سُنا دیتی ہوں، اور اگر کوئی باپ یا کوئی ماں یا کوئی بھائی یہ کہے کہ یہ اُس کے گھر کی بات نہیں تو اُسے اپنی بیٹی اور اپنی بہن کے اٹیچی کیس، الماری اور اُس کی کتابوں کو ذرا اور غور سے دیکھ لینا چاہیئے بلکہ محترم احمد یار خان کی نظروں سے دیکھ لینا چاہیئے۔ میں والدین کو ایک خطرناک خود فریبی سے نکالنے کے مقصد سے یہ راز فاش کر رہی ہوں۔ میں فلسفے، مذہب اور نفسیات کا لیکچر نہیں دوں گی۔ میں لیکچر دے بھی نہیں سکتی۔ اتنا علم ہوتا تو اس حال تک کیوں پہنچتی۔ میں آپ سے جو ایڈیٹر ہیں، محترم میم۔ الف سے جو ماہرِ نفسیات ہیں اور مذہب کے راہنماؤں سے پوچھتی ہوں کہ میں اب کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ اور کیا مجھ پر جو بیتی ہے اسے سزا سمجھ کر قبول کر لوں؟

میں متوسط طبقے (مڈل کلاس) کی عورت ہوں۔ بعض مجھے لڑکی کہتے ہیں کیونکہ میری عمر چھبیس سال نہیں ہوئی۔ ابھی تین مہینے باقی ہیں لیکن میں اپنے آپ کو عورت کہتی ہوں۔ پانچ سال ایک شخص کی بیوی رہ چکی ہوں اور اُسے میں دو بچے دے آئی ہوں۔ میں اُس وقت دسویں جماعت میں پڑھتی تھی جب میں نے پہلا افسانہ پڑھا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ عمر کے پندرہویں سولہویں سال لڑکی کے وہ جذبات بیدار ہوجاتے ہیں جن کے ساتھ شرم اور حجاب وابستہ ہے۔ اس پہلے افسانے نے میرے جذبات کو اس طریقے سے اُبھارا کہ مجھے لُطف سا محسوس ہُوا۔ میں اس لُطف کو اچھی طرح بیان نہیں کرسکتی۔ میں ایسے ہی ایک اور افسانے کی تلاش کرنے لگی جو مجھے مل گیا۔ یہ کوئی ایسا پرچہ نہیں تھا جس پر فحاشی کا الزام عائد کیا جاسکے۔ یہ اُن چند ایک پرچوں میں سے تھا جو اپنے آپ کو پاکیزہ ادب کا علمبردار سمجھتے ہیں اور آج کل کہتے ہیں کہ انہیں ناپاک پرچوں نے تباہ کردیا ہے ——— میری تباہی کا آغاز ایک پاکیزہ پرچے سے ہُوا تھا۔

ان افسانوں میں عشق و محبت اور عشقیہ مکالمے تھے۔ حُسن اور جوانی کی تعریفیں کھُلے الفاظ میں کی گئی تھیں۔ الفاظ میں ایسا اثر کہ ہر لفظ دل میں اُترتا گیا۔ یہ ۱۹۶۶ء کے ابتدائی مہینے تھے جب ستمبر ۱۹۶۵ء کا جذبہ تازہ تھا۔ میں نے ستمبر کی جنگ میں ایک رات خدا سے گلہ کیا تھا کہ مجھے لڑکی بناکر دنیا میں کیوں بھیجا تھا۔ لاہور کی توپیں جب گرجتی تھیں تو خون میں ایسا جوش آتا تھا جو میرے قابو سے باہر ہوجاتا تھا۔ دل میں یہی ایک عزم تڑپتا تھا کہ محاذ پر چلی جاؤں۔ ان میں سے ایک توپ میرے گھر کے قریب تھی۔ ایک روز میرے ہاتھ میں خالی پرچ پیالی تھی۔ اس توپ نے گولہ داغا تو میرا ہاتھ اتنی زور سے کانپا کہ پرچ میرے ہاتھ میں رہ گئی، پیالی گری اور ٹوٹ گئی۔

میرے بڑے بھائی نے قہقہہ لگاکر کہا ——— "ڈر گئی، ڈر گئی"۔

"نہیں بھائی جان!" ——— میں نے بناوٹی ہنسی سے کہا ——— "میں ڈری نہیں۔ میرے ہاتھ اب پرچ پیالی کو قبول نہیں کرتے۔ ان ہاتھوں میں اب

رائفل ہونی چاہیئے۔"

میرے بھائی نے اسے شاید مذاق سمجھا ہو لیکن یہ الفاظ میرے دل سے نکلے تھے۔ میں اپنے جذبات کا اظہار اس سے بہتر الفاظ میں نہیں کرسکتی تھی۔ مجھے گھر سے باہر جانے کی اتنی آزادی نہیں تھی کہ جہاں جی میں آتی نکل گئی۔ میں سکول برقعے میں جاتی تھی۔ گھریلو ماحول میں مسلمان گھرانوں والی شرافت تھی۔ میں نے پردے اور برقعے کو کبھی ناپسند نہیں کیا تھا۔ میں آج بھی ان اخلاقی پابندیوں کو ناپسند نہیں کرتی۔ البتہ بھارت نے جب پاکستان پر حملہ کیا تو مجھے برقعہ ایسے لگا جیسے مجھے کھڑا کرکے میرے اردگرد پتھروں کی دیوار چُن دی گئی ہو۔ مجھ پر زندہ درگور ہونے کی گھٹن طاری ہوگئی تھی۔ بعض اوقات یہ احساس مجھے پریشان کرتا تھا کہ میرا گھر بیٹھے رہنا ملک سے غداری ہے اور جیسے میں دیدہ و دانستہ اپنے فرائض سے کوتاہی کررہی ہوں۔

میرے اباجان نے ہم پر کبھی سختی نہیں کی تھی۔ وہ ڈانٹ ڈپٹ اور حکم چلانے کے بھی عادی نہیں تھے۔ میں تین بھائیوں میں ایک بہن تھی۔ ہم آپس میں کبھی نہیں لڑے تھے۔ ہمارے گھر لڑائی جھگڑے کا رواج ہی نہیں تھا۔ گھر میں امی کی مرضی اور پسند کا اتنا ہی دخل تھا جتنا اباجان کا۔ ان دونوں کی آپس میں کبھی ترش کلامی بھی نہیں ہوتی تھی۔ تنہائی میں شاید ہوتی ہو۔ ہمارے سامنے کبھی نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے ہم مطمئن لوگ تھے۔ گھر میں ہنستے کھیلتے بھی تھے۔

چار دیواری کے اندر ہم دو عورتیں تھیں۔ میری امی اور میں۔ ہم دونوں نے کبھی قید محسوس نہیں کی تھی۔ میں نویں جماعت میں پہنچی تو میں نے خود اباجان سے کہا تھا کہ مجھے بُرقعہ سلادیں۔ وہ بہت ہنسے تھے۔ میری امی سے بولے ——— "لے تیری بیٹی جوان ہوگئی ہے۔ اب باورچی خانہ اس کے حوالے کردے اور باقی عمر آرام سے گزار"۔

"اس کے حوالے کیوں کردوں؟" ——— امی نے مسرور لہجے میں کہا تھا ——— "یہ اپنے گھر کا باورچی خانہ سنبھالے گی۔ میرا باورچی خانہ تو ایک چھوڑ تین بہوئیں سنبھالیں گی۔ میں اپنی بچی کو شہزادی بناکر ڈولی میں بٹھاؤں گی"۔

یہ تھی ہمارے گھر کی فضا جس میں سنجیدہ باتیں بھی خندہ پیشانی سے ہُوا کرتی تھیں۔ کوئی تلخی نہیں ہوتی تھی۔ ماں باپ نے بچوں سے کچھ چھپانے کی بھی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ ایسی گھریلو فضا میں دماغ بھٹکتے نہیں، ٹھکانے رہتے ہیں اور اچھی باتیں سوچتے ہیں۔ ابّا جان ہمیں سنایا کرتے تھے کہ انہوں نے پاکستان کس طرح بنایا اور کیوں بنایا تھا۔ اُنہوں نے ہمارے دلوں میں وطن اور آزادی کی محبت بٹھا دی تھی۔ اُنہوں نے ہمیں یہ بھی بتایا تھا کہ اس پاک خطّے کے لئے کتنا زیادہ خون دیا گیا ہے۔ میں نے ہر ایک بات سمجھ لی تھی لیکن جو بات میری رُوح میں کانٹے کی طرح اُتر گئی تھی وہ یہ تھی کہ مجھ جیسی ہزاروں پردہ نشین لڑکیاں اغوا ہو گئی تھیں اور ہزاروں کو ہندوؤں اور سکھوں نے بے آبرو کر کے قتل کر دیا تھا۔

ابّا جان نے مجھے اور میرے بھائیوں کو ہمارا شعور بیدار ہوتے ہی پوری تفصیل سے بتانا شروع کر دیا تھا کہ ۱۹۴۷ء کے دَور کے مسلمانوں نے انگریزوں کی حکومت کے خلاف کس طرح جنگِ آزادی لڑی تھی۔ عورتوں نے مردوں کے دوش بدوش جس بے جگری سے اس جہاد میں حصّہ لیا تھا وہ سُن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ بھارت سے مسلمانوں کی ہجرت کی کہانی میرے ذہن میں اٹک کے رہ گئی تھی۔ ابّا جان کی سنائی ہوئی باتوں نے مجھے سچّا پاکستانی بنا دیا تھا۔ وطن سے وفاداری اور وطن کے لئے قربانی کا جذبہ تب ہی پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ معلوم ہو کہ اس وطن کے لئے ہم نے کتنی جانیں قربان کی تھیں۔ تاریخ سے جہاں تک میری واقفیت ہے میں کہہ سکتی ہوں کہ اپنے وطن کی خاطر جتنی جانیں اور عصمتیں اور جتنے بچے ہماری قوم نے قربان کئے ہیں اس کی مثال کوئی قوم پیش نہیں کر سکتی۔ بعض قوموں نے مثلاً امریکہ، فرانس اور روس نے خانہ جنگی لڑی ہے جو دراصل فوجوں کی جنگ تھی۔ دونوں طرف ایک جیسا اسلحہ اور بارود تھا، لیکن ہم اپنی جنگِ آزادی میں نہتے تھے اور ہمارے مقابلے میں انگریز کی فوج اور ہندوؤں کی دولت اور انگریز پرستی تھی۔ یہ متحدہ محاذ ہر ہتھیار اور ہر حربے سے لیس

تھا۔ اس پہلو کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہیں کہ ہماری جنگِ آزادی کی مثال تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

اُس وقت ہمارے ابّا جان نوجوان تھے۔ انہوں نے اور اُن کے دوستوں نے اور اُن کی ہم عمر لڑکیوں نے انگریزوں کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکال لی تھی۔ میں آپ کو وہ ساری باتیں سنانے لگوں گی تو میری بات کی گنجائش ہی نہیں رہے گی۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ابّا جان نے میری رگ رگ میں اور میرے بال بال میں پاکستان کی عظمت ڈال دی تھی۔ یہ ایک آگ تھی جو ستمبر ۱۹۶۵ء میں میرے سینے میں بڑی زور سے بھڑکی تھی مگر میں لڑکی تھی اس لئے کچھ بھی نہ کر سکی۔ اعلانِ تاشقند میری آگ کو ٹھنڈا نہیں کر سکا تھا۔ یہ شاید اور بھڑک اُٹھی تھی۔ اگر اسی پر اکتفا کی جاتی کہ تاشقند میں بھارت کے ساتھ کوئی رسمی سا معاہدہ ہو گیا تو برداشت کیا جا سکتا تھا۔ یہ ناقابلِ برداشت تھا کہ طلباء نے یہ نعرہ لگا کر جلوس نکالے کہ ہم ہندو کے ساتھ کوئی معاہدہ قبول نہیں کریں گے تو اُن پر لاٹھیاں برسائی گئیں اور اُن پر گولی چلائی گئی۔ پھر یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا گیا کہ ہندو کے ساتھ ہماری کوئی دشمنی ہی نہیں۔ یہ پروپیگنڈہ اُس وقت شروع کیا گیا جب ستمبر کے شہیدوں کی قبروں کی مٹی ابھی خشک نہیں ہوئی تھی اور ہمارے اُن فوجی بھائیوں کے زخموں سے ابھی خون رِس رہا تھا جو ٹانگیں اور بازو کٹوا کر فوجی ہسپتالوں میں پڑے تھے۔

میں آج جو باتیں سوچ اور کر سکتی ہوں وہ اُس وقت نہیں سوچ سکتی تھی جب میں دسویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ جذبات کا اظہار کرنے کی عقل نہیں تھی۔ اُبال سا اُٹھتا تھا اور اوٹ پٹانگ سی باتیں مُنہ سے نکل جاتی تھیں۔ ان سے تسکین نہیں ہوتی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے سینے کے اندر کچھ گل سڑ رہا ہے۔ ابّا جان احتجاج کے لہجے میں باتیں کرتے تھے تو خون اور زیادہ جوش میں آتا تھا۔ اس احتجاج اور جذبے کے اُبال نے میرے جذبات کی یہ حالت کر دی کہ میں عجیب سی بے چینی، مایوسی اور کوفت سی محسوس کرنے لگی۔ میں نے اپنی چند ایک کلاس فیلو لڑکیوں کو بھی اسی جذباتی حالت میں دیکھا۔

اسی ذہنی اور جذباتی کیفیت میں مجھے پہلا افسانہ پڑھنے کو ملا۔ میرا ذہن
ابھی پختہ نہیں تھا۔ جذباتی خلفشار اور بے چینی کو اس افسانے نے ذرا سی دیر
کے لئے تسکین دی۔ اس کے بعد میں اسی قسم کے افسانے پڑھنے لگی۔ میں نے
دس جماعتیں بڑے اچھے نمبروں سے پاس کر لیں۔ مجھے کالج میں داخل کرا دیا
گیا۔ دو سہیلیاں سکول کے زمانے کی ساتھ تھیں۔ تین چار کالج میں بن گئیں۔
یہ سب میری طرح مڈل کلاس خاندانوں کی لڑکیاں تھیں۔ ان میں دو افسانوی
ادب کی شوقین تھیں بلکہ ضرورت سے زیادہ شوقین تھیں۔ انہوں نے مجھے
ایسے افسانے پڑھنے کو دیتے جو عریاں تو نہیں تھے لیکن لکھنے والوں نے
کوئی کسر بھی نہیں رہنے دی تھی۔

میں ان سہیلیوں کے ساتھ سیکنڈ ایئر میں چلی گئی۔ ستمبر ۱۹۶۵ء دو سال پیچھے
رہ گیا تھا۔ گھر میں اباجان کی زبان سے جذبے کی بات سنائی دیتی تھی جو میں پوری
دلچسپی سے سنتی تھی۔ کالج میں کسی لیکچرار یا پروفیسر کی زبان سے کبھی نہیں سنا تھا
کہ پاکستان کس طرح حاصل کیا گیا تھا۔ اس کی بجائے ہماری ایک لیکچرار نے
تو ایسا تکیہ کلام بنا رکھا تھا جو پاکستان کی توہین تھا۔ وہ کسی ملک کی تعریفیں کرتے
ہوتے کئی بار کہا کرتی تھی ——— "یہ اس پاکستان کی طرح نہیں کہ لوگ غلیظ، جاہل
اور پسماندہ۔ امریکہ میں لوگ ....." اور وہ امریکہ کے لوگوں کی تعریفوں کے پل باندھ
دیا کرتی تھی۔ تین چار بار اس نے بھارت کے معاشرے کی باتیں کیں اور کہا ———
"یہ اس پاکستان کی طرح نہیں کہ ....."

کالج کے ماحول میں پاکستان کم ہی نظر آتا تھا۔ میں جس کالج میں پڑھتی تھی
وہ فیشن ایبل اور آزاد خیال لڑکیوں کا نہیں، ہم جیسی درمیانہ درجے یا غریب
گھرانوں کی پردہ دار لڑکیوں کا کالج تھا، اس لئے فیشن اور غلط قسم کی آزادی کی
شیدائی لڑکیوں کی تعداد کم تھی۔ ایسی لڑکیاں بھی تھیں جو اندرون شہر یا ایسی
ہی پرانی آبادیوں کی رہنے والی تھیں۔ یہ صحیح معنوں میں چار دیواری کی دنیا
میں زندگی گزارنے والی لڑکیاں تھیں۔ ان میں ان پڑھ مگر روپے پیسے والے
دکانداروں اور تاجروں کی بیٹیاں بھی تھیں۔ ایسے باپوں کی بیٹیاں بھی جنہیں گھر میں

چھت پر زیادہ دیر کھڑا رہنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ یہ جب کالج میں آتی تھیں
تو گیٹ میں داخل ہوتے ہی برقعہ اتنی عجلت سے اتارتی تھیں جیسے ایک ناگوار
بوجھ اتار پھینکا ہو۔ وہ شرافت اور پردے کو پسماندگی سمجھتی اور عجیب بناوٹی سی
حرکتیں کیا کرتی تھیں۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ آزاد خیال گھرانوں سے تعلق
رکھتی ہیں آزاد خیال اور فیشن پرست لڑکیوں میں اٹھتی بیٹھتی اور انگریزی
بولنے کی کوشش کرتی تھیں۔

انداز ایسے تھے جیسے سب کی توجہ اپنے آپ پر ہے اور جیسے ان
کا کوئی اپنا ملک نہیں کوئی قوم نہیں اور قومی سطح پر ان کے کوئی فرائض
نہیں اور اگر وقار کے نام سے کوئی واقف تھی تو یہ اپنی ذات کا وقار تھا
قوم اور ملک کا نہیں، لیکن میں ذاتی طور پر کہتی ہوں کہ یہ سب بے قصور تھیں۔
قومیت کا احساس کبھی پیدا کیا ہی نہیں گیا تھا۔ نہ سکول میں نہ کالج میں۔ کتابیں
خالی، کتابیں پڑھانے والوں کے ذہن خالی۔ جہاں ایک لیکچرار بھارت کے
کسی ادیب کی تعریف کرتے ہوتے یہ کہے کہ یہ اس پاکستان کی طرح نہیں،
وہاں پاکستان کا وقار نہیں "اس پاکستان" کے خلاف نفرت پیدا نہیں ہو گی تو اور
کیا ہو گا۔

میں کوئی فرشتہ نہیں تھی۔ میرے کردار کے اردگرد لوہے کا جنگلا یا پتھروں
کی دیوار نہیں تھی کہ ماحول سے متاثر نہ ہوتا۔ مجھ سے زیادہ اچھے اور مضبوط کردار
کی لڑکیاں بھی اسی رنگ میں رنگی جا رہی تھیں۔ وہ کوئی بدکردار تو نہیں ہو گئی تھیں،
صرف یہ ہوا تھا کہ وہ اپنی قومیت اور قومی عظمت سے بیگانہ ہو گئی تھیں۔ اس
بیگانگی کو کسی نے جرم نہ سمجھا۔ میں بھی انہی لڑکیوں میں اٹھتی بیٹھتی اور چھ سات گھنٹے
انہی میں گزارتی تھی۔ میں پہلے بتا چکی ہوں کہ میں نے برقعے اور پردے کو کبھی
ناپسند نہیں کیا تھا۔ گھر میں گھٹن بھی نہیں تھی اس لئے مجھے ان پابندیوں کے
خلاف درپردہ بغاوت کرنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی، لیکن میں کالج
کے ماحول کے اثرات قبول کرتی چلی گئی۔ افسانے پڑھنے کی عادت پڑ ہی چکی تھی
اور میں ان سے لطف اٹھانے لگی تھی۔

ایک روز ایک لڑکی نے مجھے اردو کا ایک ناول دکھایا۔ اس کا کاغذ گھٹیا تھا اور اس کے ورق اس قدر بوسیدہ ہو گئے تھے جیسے اس کو پڑھ کر کم و بیش ایک ہزار افراد نے پڑھا ہو۔ یہ لڑکی میری ہمراز سہیلی تھی۔ اُس نے یہ ناول ایک اور لڑکی سے لیا تھا۔ میں نے ویسے ہی ناول کھولا۔ درمیان کا ایک صفحہ سامنے آیا۔ میں نے چند فقرے پڑھے تو میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں اور میں نے ایسا ہی لرزہ اپنی ذات میں بھی محسوس کیا۔ شاید میرا پسینہ بھی پھوٹ آیا تھا۔ میں جو صفحہ پڑھ رہی تھی وہ الفاظ ہی تھے لیکن میری آنکھوں کے سامنے ایک مرد اور عورت کی تصویر آگئی جو مادرزاد ننگے تھے ہر ایک لفظ اور اصطلاح کو کھل کر لکھا گیا تھا۔ ایسے الفاظ کسی لغت میں نہیں ملتے، مرد زبانی بولا کرتے ہیں۔

میرے چہرے کا رنگ بدلتا دیکھ کر میری سہیلی نے ہنس کر کہا —— "شروع سے پڑھو لیکن کل واپس کر دینا۔ وہ کہتی تھی کسی اور کو نہ دینا۔"

میں اگر ماہرِ نفسیات ہوتی تو آپ کو بتاتی کہ میری ذات میں کیا تبدیلی آتی اور کیوں آتی۔ میں آپ کو من و عن سنا رہی ہوں کہ میں نے کیا کیا اور اس کے بعد کیا ہُوا۔ میں جانتی ہوں کہ ماہرِ نفسیات آپ بھی نہیں اس لئے آپ مجھ پر بدخیالی اور بدکرداری کا اور گمراہی کا الزام تھوپیں گے لیکن میں آپ کو خبردار کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ میں یہ ناول نہیں پڑھنا چاہتی تھی۔ مجھے پڑھنا بھی نہیں چاہیئے تھا۔ کسی بھی لڑکی کو نہیں پڑھنا چاہیئے تھا مگر میں نے ناول اپنی سہیلی کو واپس بھی نہ کیا۔ کلاس روم میں جا کر اپنی کتابوں میں رکھ لیا۔ افسانوں نے میرے ذہن میں زمین ہموار کر رکھی تھی۔ عشق و محبت کے مناظر اور مکالمے مجھے پہلے ہی اچھے لگنے لگے تھے۔ اس ناول نے وہی مناظر پوری طرح بے پردہ کر دیئے۔

میں نے ناول رات کو پڑھا جب گھر والے سمجھتے تھے کہ میں پڑھ رہی ہوں۔ میرے کمرے میں کوئی نہیں آتا تھا۔ میں مرد اور عورت کے تعلقات کی غلاظت میں پوری طرح اُتر گئی۔ میں نے پونے دو سو صفحوں کا یہ ناول آدھی رات کے بعد تک ختم کر لیا۔ ناول ختم ہو گیا اور میرے اندر ایک کشمکش شروع ہو گئی۔

کبھی یہ احساس پریشان کرنے لگتا کہ میں نے ایک گناہ کا ارتکاب کیا ہے اور کبھی پُرلطف سا خمار طاری ہو جاتا اور کبھی ناول کے الفاظ میری آنکھوں کے سامنے متحرک تصویریں بن جاتے۔ میں عمر کے جس دَور میں سے گزر رہی تھی اس کے خطرے اُمڈ کر سامنے آگئے۔

دوسرے دن ناول لڑکی کو واپس کیا تو میں شرمسار سی تھی لیکن دو اور لڑکیوں نے شرمساری ختم کر دی۔ میری سہیلی نے انہیں بتا دیا تھا کہ یہ ناول میرے پاس ہے۔ انہوں نے ہنس ہنس کر مجھ سے پوچھا کہ مزہ آیا یا نہیں۔ میں نے اپنے تاثرات کچھ چھپا لیے کچھ بتا دیئے۔ مجھے پہلی بار پتہ چلا کہ اس قسم کے ناول چوری چھپے پڑھے جاتے ہیں، کالج کی کتنی ایک لڑکیاں بلا جھجک پڑھتی ہیں، اور یہ بھی معلوم ہُوا کہ ہماری دو لیکچرار بھی ان ناولوں کی عادی ہیں اور جن دو چار طالبات کے ساتھ اُن کی دوستی ہے وہ انہیں بھی یہ ناول دیتی ہیں۔

پھر یوں ہُوا جیسے اچانک ماہوار رسالوں کا ریلا آگیا ہو۔ ان میں سے دو تین رسالے لڑکیوں کے ہاتھوں میں بھی نظر آنے لگے۔ میں نے یہ دیکھے تو میں افسانوں کو بھول گئی۔ ایک لڑکی رسالے کی ساری کہانیاں پڑھ کر اپنی سہیلیوں کو بتاتی تھی کہ وہ کون کون سی کہانی پڑھیں۔ یہ ننگی اور فحش کہانیاں ہوتی تھیں۔ دوسری لڑکیوں کی طرح میں بھی اپنی کتابوں میں چھپا کر یہ رسالے گھر لے جاتی اور رات کو پڑھتی تھی۔ اب میرے اندر کوئی کشمکش نہ رہی، شرم اور جھجک نہ رہی۔ ظاہری طور پر میں شریف لڑکی تھی جو غیر مرد کے قریب سے گزرتے بھی جھینپ جاتی تھی البتہ میرا ذہن بڑے حسین تصور تخلیق کرنے کا عادی ہوتا گیا۔ میں بالکل محسوس نہ کر سکی کہ میرے ذہن میں وہ ہیرو مرتے جا رہے ہیں جنہوں نے ستمبر ١٩٦٥ء میں مجھے خدا سے یہ گلہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا کہ مجھے لڑکی بنا کر دُنیا میں کیوں بھیجا تھا۔ میں نے شہیدوں کو اپنے دل اور اپنے ذہن میں زندہ رکھا تھا اور ایک بار میں نے دسویں جماعت میں اپنی ایک سہیلی سے کہا تھا کہ پاکستان کا ایک نشانِ حیدر میرا بیٹا ہو گا۔

میرے ذہن میں شہید مرنے لگے۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا۔ اُن کی جگہ ان ناولوں

اور رسالوں کے ہیرو آ گئے جو لڑکیاں مجھے دیتی تھیں اور ہم چوری چھپے پڑھتی تھیں۔ میرے خیالوں اور میری ہر سوچ پر یہ ہیرو غالب آ گئے۔

چھٹیوں کی ایک صبح میں سب کے بستر ٹھیک کر رہی تھی۔ اپنے بڑے بھائی کے کمرے کا پلنگ درست کرنے لگی تو اُس کے سرہانے کے نیچے چادر میں چھپایا ہُوا مجھے ایک رسالہ نظر آیا۔ ٹائیٹل پر نیم عُریاں لڑکی کی بڑی ہی پُرکشش تصویر تھی۔ یہ رسالہ میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ کھول کر تین چار جگہوں سے پڑھا۔ الفاظ تو ننگے نہیں تھے لیکن جو مناظر بیان کئے گئے تھے انہوں نے میری جذباتی حالت وہی کر دی جو پہلا ناول پڑھ کر ہوتی تھی۔ اس میں تصویریں بھی دی گئی تھیں جن میں مرد اور عورت کو عریانی کی حالت میں دکھایا گیا تھا۔ یہ کیمرے سے لئے ہوتے فوٹو تھے۔ میں نے رسالے کے ورق اُلٹے تو اس میں سے ایک تصویر گری۔ میں نے اُٹھا کر دیکھی۔ یہ مرد اور عورت کی مکمل طور پر ننگی تصویر تھی۔

مجھے افسوس ہونا چاہیئے تھا کہ میرا بھائی اپنا اخلاق اور کردار تباہ کر رہا ہے مگر مجھے اطمینان ہُوا کہ میں اخلاق سوز ناول اور رسالے پڑھ کر کوئی گناہ نہیں کر رہی۔ یہ تو میرا بڑا بھائی بھی پڑھتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ انسان جب کوئی جرم اور گناہ کرنے پر تُل جاتا ہے تو اس کے حق میں جواز پیدا کر لیتا ہے۔ میں نے بھی ایسے ہی کیا۔ بھائی کہیں باہر نکل گیا تھا۔ میں کچھ وقت اس فوٹو کو دیکھتی رہی جو رسالے میں سے گری تھی۔ اس فوٹو نے مجھے تصوروں کی دنیا میں پہنچا دیا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اگر بھائی جان یہ چیزیں چھپا کر پڑھتے ہیں تو ابا جان بھی پڑھتے ہوں گے۔ اس کی تصدیق چند دنوں بعد ہوئی۔ میری ایک سہیلی نے مجھے ایسے ہی ایک رسالے کا نام بتایا اور کہا کہ اُس نے اپنے ابا جان کی ذاتی الماری میں دیکھا ہے۔ اُس نے اس کی بہت تعریفیں کیں اور دو تین کہانیوں کی جھلکیاں سُنائیں۔ میں نے اپنے ابا جان کی ذاتی الماری میں ایسا کوئی رسالہ تو نہ دیکھا لیکن کئی لڑکیوں نے بتایا کہ اُن کے باپ یہ رسالے چوری پڑھتے اور چھپا کر رکھتے ہیں اور ان کی بیٹیاں نکال کر پڑھ لیتی ہیں۔

میں نے اُس کے ساتھ اس فوٹو کا ذکر کیا جو میرے بھائی کی کتاب سے گرا تھا۔ اُس نے بتایا کہ ایسی تصویریں مل سکتی ہیں۔ آٹھ دس روز بعد تصویریں مل گئیں۔ یہ آٹھ فوٹو تھے جو ایک لڑکی نے ہمیں دکھائے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ ایک لڑکی کی دوستی ایک لڑکے کے ساتھ ہے جو اسے اکثر کالج کے باہر ملتا ہے۔ یہ بھی پتہ چلا کہ کبھی کبھی یہ لڑکی گیٹ والی مائی کو پیسے دے کر کلاس کے دوران باہر نکل جاتی ہے اور اس لڑکے کے ساتھ جو کسی اور کالج میں پڑھتا ہے کہیں چلی جاتی ہے۔ یہ حرکت بھی ایک لڑکی نہیں کرتی تھی اور بھی بہت تھیں اور چوری کی یہ دوستیاں وبا کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ جس دوستی میں ننگی تصویروں اور رسالوں کا عمل دخل تھا وہ دوستی کیسی ہو گی۔ اس دوستی میں اُن پردہ نشین لڑکیوں میں سے بھی تین چار کے نام شامل تھے جن کے ہاتھ بھی بُرقعوں میں سے نظر نہیں آیا کرتے تھے۔

دوستی کی پیشکش مجھے بھی ہوتی تھی۔ چھُٹی کے وقت کالج کے باہر کھڑے نوجوان سکوٹروں اور کاروں پر لفٹ پیش کرتے تھے۔ پیچھا بھی کرتے تھے، لیکن میں بتا نہیں سکتی کہ میرا ذہن پراگندہ ہونے کے باوجود میں نے ایسی کوئی پیش کش قبول نہ کی۔ میری سہیلیوں میں بھی ایسی تھیں جو کسی مرد کے ساتھ بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں۔ اس کے باوجود میں اپنے آپ کو شریف لڑکی نہیں سمجھتی کیونکہ میرے تصورات جن سے مَیں دل بہلاتی تھی وہ شریفانہ نہیں تھے۔ میں یہ ننگے فوٹو دیکھتی رہتی تھی۔ یہ یورپ کے مردوں اور عورتوں کی تصویریں تھیں۔ مجھے مردوں کے جسم اچھے لگتے تھے۔ اُن کے چہرے بھی خوبصورت تھے۔

مَیں بی۔ اے کے آخری سال میں تھی۔ میرے بڑے بھائی کی شادی ہو گئی۔ بھابھی میری ہم عمر تھی اور وہ ہنسنے کھیلنے والی لڑکی تھی۔ اُس کے ساتھ میری دوستی گہری ہو گئی۔ یہ دوستی وہی رنگ اختیار کر گئی جو کالج کی سہیلیوں کے ساتھ تھی۔ ہم ہمراز بن گئیں۔ میں اُس سے ننگی باتیں پُوچھتی اور وہ مجھے بتاتی تھی۔ میرے ذہن میں اب یہی کچھ رہ گیا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ میرا بھائی

ایسے ویسے رسالے پڑھتا ہے، وہ مجھے اُس سے چوری دے دیا کرے۔ اُس نے بتایا کہ صرف رسالے نہیں اُس کے پاس ننگی تصویریں بھی ہیں۔ ایک روز اُس نے بھائی سے چوری مجھے تصویروں کا ایک بنڈل دیا۔ میں نے ظاہر کیا کہ میں نے ایسی تصویریں پہلے کبھی نہیں دیکھیں۔ یہ تو جیسے میری رُوح کی غذا بن چکی تھیں۔ مجھے یہ بھی پتہ چل چکا تھا کہ ہر محلّے میں دکانوں کی طرح لائبریریاں کھُلی ہوتی ہیں جن سے کراتے پہ ناول مل جاتے ہیں۔ ان میں سامنے صاف ستھرے ناول نظر آتے ہیں لیکن ننگے ناول اور فوٹو چھپا کے رکھتے ہیں۔ وہاں سے یہ چیزیں لڑکیوں تک در پردہ پہنچتی ہیں۔

پہلا افسانہ پڑھنے سے لے کر بھابھی سے رنگین فوٹو لے کر دیکھنے تک چار سال گزُر چکے تھے۔ میرے دل میں مینارِ پاکستان مسمار ہو چکا تھا۔ شہیدوں کی یادگاریں مٹ گئی تھیں۔ ابّاجان کی پُرانی باتیں مجھے فرسودہ قصّے معلوم ہونے لگی تھیں۔ میرے گھر والوں کو شک تک نہ تھا کہ میں اندر سے کتنی بدل گئی ہوں۔ محلّے برادری والے بھی مجھے شریف لڑکی سمجھتے تھے۔ ان کی رائے غلط نہیں تھی۔ مَیں نے کسی کے ساتھ در پردہ دوستی نہیں کی تھی۔ میرے چال چلن کے خلاف کسی کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ میں خود بھی مطمئن تھی کہ میں نے ظاہری طور پر کبھی کوئی حرکت نہیں کی تھی جس سے میرے باپ کی عزّت کو داغ لگتا۔ میری ذات کے اندر کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں چونکہ شریف لڑکی تھی، میرا خاندان شریف تھا اس لئے ایک شریف گھرانے نے میرا رشتہ مانگ کر یہ شرط بھی پیش کی کہ شادی فوراً ہونی چاہیئے۔ میرے ماں باپ مان گئے۔ کہنے لگے کہ بی۔ اے کی ڈگری کی نسبت شادی ضروری ہے۔ لڑکے کا خاندان شرافت اور معاشی طور پہ اچھا تھا۔ میں بہت خوش ہوئی لیکن اس خوشی کا رنگ ان تصویروں جیسا تھا جو میں چوری چھپے دیکھا کرتی تھی۔ مجھے ازدواجی زندگی اُن کہانیوں کی طرح نظر آتی تھی جن کی میں عادی ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے ہونے والے دولہا کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ شہر کے دوسرے سرے پر رہتے تھے۔ قدرتی طور پہ ہر لڑکی کی یہ خواہش

ہوتی ہے کہ جس کے ساتھ اُسے ساری عمر گزارنی ہے اور جس کے بچّوں کی اُسے ماں بننا ہے اُسے وہ دیکھ کر دو کیا ہے۔

چار دیواری کی دُنیا میں دیکھنے دکھانے کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ لڑکی سے پوچھنا بھی پسند نہیں کیا جاتا۔ میں بھی اسی دنیا کی لڑکی تھی جس میں لڑکیاں دیواروں میں بند رہتی ہیں۔ باہر نکلتی ہیں تو برقعوں میں بند ہوتی ہیں، پھر انہیں ڈولی میں بند کر کے ایک اور چار دیواری میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ان لڑکیوں کو جب ہونے والا دُولہا نظر نہیں آتا تو اسے وہ تصوّروں میں دیکھتی ہیں۔ ان کے تصوّر اپنے جذبات، اپنی خواہشات اور اپنی پسند کے عین مطابق ہوتے ہیں۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ دولہا سامنے آتا ہے تو تصوّروں کے بُت پاش پاش ہو جاتے ہیں۔

میں کہہ رہی تھی کہ میں بھی اسی دنیا کی لڑکی تھی۔ میں نے بھی اپنے ہونے والے دولہا کو تصوّروں میں دیکھنا شروع کر دیا مگر جو تصوّر بنتا تھا وہ اُن ننگے مردوں کی طرح ہوتا تھا جن کے میں نے فوٹو دیکھے تھے۔ یہ مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ گٹھے ہوئے جسم، دراز قد اور شکل و صورت میں جادو کا اثر۔ میں جانتی تھی کہ میرا دولہا ایسا نہیں ہو سکتا مگر میرے تصوّرات کوئی اور شکل قبول کرتے ہی نہیں تھے۔ میں نے دولہا کا یہی بُت ذہن میں بنا لیا — اور یہ بُت پہلی رات ہی ٹوٹ گیا۔

اُس نے جب میرا گھونگھٹ اُٹھایا تو میں نے اُسے دیکھا۔ سر سے پاؤں تک دیکھ ڈالا۔ وہ میری عمر کا دُبلا پتلا سانولے رنگ کا لڑکا تھا۔ مجھے بجلی کے جھٹکے کی طرح دھکا لگا۔ میں نے دوسری بار سر اُوپر نہیں اُٹھایا۔ یہ وہم بھی ہُوا جیسے مجھے غلط جگہ بٹھا گئے ہوں یا یہ کوئی اور ہو، مگر ایسا نہیں تھا۔ یہی میرا دولہا تھا۔ اُس نے باریک سی گردن پر جو بال بڑھا کر ڈال رکھے تھے مجھے بہت بُرے لگے۔ میں اُس آدمی کے تصوّر کو ذہن سے نکالنا نہیں چاہتی تھی جس کا ننگا جسم میں نے تصوّروں میں دیکھا تھا اور جس کی میں نے کہانیاں پڑھی تھیں، مگر مجھے اِس ہم عمر نوجوان کو قبول کرنا تھا۔ میں بھاگ نہیں سکتی

تھی۔ بغاوت کی تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

میں نے اُسے زندگی کے ساتھی کی حیثیت سے قبول کر لیا لیکن میں نے اپنی تصوراتی دنیا کے گرد قلعہ تعمیر کر لیا اور اس سے دل بہلانے لگی۔ کالج چھوٹ چکا تھا۔ اس سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ میں من پسند پرچوں اور تصویروں سے محروم ہو گئی۔ یہ ایک نشہ تھا جو چھوٹ گیا تو میری طبیعت بیزار رہنے لگی۔ کالج کی سہیلیاں ملنے آئیں تو میں نے انہیں کہا کہ وہ کوئی پرچہ دے جایا کریں۔ دوسرے دن ایک لڑکی مجھے دو پرچے دے گئی۔ شادی کو تقریباً دو مہینے گزر چکے تھے۔ میں نے اپنے خاوند کو نہ کسی ایسے پرچے کا نام لیتے سُنا نہ کبھی ذکر ہوا کہ وہ کوئی پرچہ پڑھا کرتا ہے یا نہیں۔ میں نے یہ سوچ کر کہ میرا بھائی یہ پرچے پڑھتا ہے اور آج کل شاید ہی کوئی ان پرچوں سے محفوظ ہو، اپنے خاوند سے ایک روز پوچھا کہ ادب کے متعلق اس کا ذوق کیسا ہے۔ میں نے ادب کا نام لے کر اس پر رُعب ڈالنے کی کوشش کی تھی۔

"کوئی پاک صاف افسانہ یا ناول مل جاتے تو پڑھ لیتا ہوں" — اُس نے جواب دیا — "لیکن عادت کے طور پر میں نہیں پڑھا کرتا۔"

میں نے ان پرچوں اور ناولوں کا ذکر چھیڑ دیا جن کی میں نشئی ہو گئی تھی۔ اُس نے بتایا کہ اُسے اِن کہانیوں سے نفرت ہے اور اُس کے ابا جان گھر کے ہر فرد پر نظر رکھتے ہیں کہ کوئی ایسے رسالے گھر میں نہ لائے۔ میرے خاوند نے ان رسالوں کے خلاف لیکچر شروع کر دیا اور وہی کچھ کہا جو آپ اس لٹریچر کے خلاف "حکایت" میں لکھا کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس لٹریچر نے ہماری نئی نسل کو اخلاقی اور قومی لحاظ سے تباہ کر دیا ہے اور یہ دشمن کی سازش کے تحت ہمارے ملک میں آیا ہے۔

وہ بولتا رہا اور میں بور ہوتی رہی۔ مجھے بالکل احساس نہیں تھا کہ میں اس تباہی تک پہنچ چکی ہوں۔ اس کی جگہ یہ احساس مجھے پریشان کر رہا تھا کہ کیسا مُردہ دل خاوند ملا ہے۔ میں نے اپنے تصوّروں کی دنیا کو اور زیادہ خوشنما بنا لیا تاکہ حقیقی زندگی کی تلخیوں سے بچی رہوں۔ سسرال گھر میں مجھے کسی چیز

اور کسی انسان کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

۱۹۷۱ء کے سال جب مشرقی پاکستان میں پاکستانی پاکستانی کا خون بہا رہا تھا، مجھ جیسی لڑکیوں کی عصمتیں اُسی طرح لُٹ رہی تھیں جس طرح ابا جان سناتے تھے کہ ۱۹۴۷ء میں ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں لُٹی تھیں، بچے کٹ رہے تھے، میں اپنے تصوّروں میں مخمور تھی۔ خون کے دریا بہا کر حاصل کیا ہوا پاکستان پاکستانیوں کے خون میں ڈوب رہا تھا، میں سسرال اور خاوند سے چوری سہیلیوں کے لائے ہوئے رسالے اور ناول پڑھ رہی تھی۔ میں اُس روز میکے گئی ہوئی تھی۔ شام کو ابا جان باہر سے آئے۔ سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ بولے — "ختم ہو گیا۔ ہم لُٹ گئے۔"

میں نے اُن کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ وہ چارپائی پر بیٹھ گئے اور سر ہاتھوں میں لے لیا۔ ان کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ میں نے انہیں جھنجھوڑ کر پوچھا — "ابا جان کیا ہوا؟" — میرا دل بُری طرح اُچھل رہا تھا۔

"مشرقی پاکستان گیا" — اُنہوں نے کہا — "ہماری فوج نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔"

میں نے سکون کی آہ بھری اور میرے مُنہ سے نکلا — "آپ نے تو ڈرا ہی دیا تھا ابا جان! میں سمجھی تھی کہ آپ کی جیب کٹ گئی ہے۔"

ابا جان نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے کچھ بھی نہ کہا۔ مجھے حیرت سے دیکھتے رہے اور میں وہاں سے ہٹ گئی۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ مغربی پاکستان میں ایک اور جنگ لڑی جا رہی ہے۔ بھارتی طیاروں کے زناٹے اور ان کی بمباری کے دھماکے بھی سُنتے تھے مگر ایسے جیسے ان کے ساتھ میرا کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ میرے تصوّروں کے قلعے میں کسی نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ اس قلعے کو کوئی سر نہ کر سکا۔ البتہ میرا ذہن اس پروپیگنڈے کو قبول کرنے لگا جو پاکستان کے خلاف اور پاکستان کی فوج کے خلاف شروع ہو گیا تھا۔ یہی آواز کان میں پڑتی تھی — "ہماری فوج تھی ہی ایسی" — مجھ جیسی لڑکیاں جن کے ذہنوں میں میری طرح رسالوں،

ناولوں اور تصویروں کی دُنیا آباد تھی، یہاں تک کہنے لگی تھیں کہ ہندوستانی ٹھیک کہتے ہیں پاکستان بننا ہی نہیں چاہیئے تھا۔ میں نے ان حقائق اور اسباب پر دھیان ہی نہ دیا جو ہماری شکست کے ذمہ دار تھے۔ مجھے بالکل احساس نہیں تھا کہ میرے ملک اور میری قوم کا دشمن مجھے پانچ چھ سال پہلے شکست دے چکا ہے جب میں نے عشق و محبت کی پہلی اشتعال انگیز تحریر پڑھی تھی ـــ قوم کی بیٹی، اسلام کی مجاہدہ نے اُسی روز ہتھیار ڈال دیئے تھے۔

میرا خاوند جسمانی لحاظ سے جیسا کیسا بھی تھا ذہن اور کردار کے لحاظ سے پُختہ اور حقیقت پسند تھا۔ میں اس کے برعکس تصوّر پرست تھی اور حقیقت سے دُور۔ اُس وقت میں تصوّروں کو ہی حقیقت سمجھتی تھی .... شادی کے تیسرے سال میرا پہلا بچّہ پیدا ہُوا۔ میں نے نو ماہ اس بچّے کا بوجھ اس طرح اُٹھائے رکھا جیسے کسی انسان پر سزا کے طور پر ایک من وزن کا پتھر رکھ دیا جاتے۔ میرے تصوّروں نے مجھے جس جسمانی لذت پرستی کا عادی بنا دیا تھا اس میں بچّہ رُوح کو کُچل دینے والی رکاوٹ تھا۔ میں اپنے آپ میں مگن رہنے والی لڑکی تھی۔

ـــ بچّے کی پیدائش سے پہلے میرے سُسرال کو میرا رویّہ چُبھنے لگا تھا۔ میں گھر کے کسی کام میں دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ کام کرتی تو تھی لیکن نیم بیداری کی حالت میں۔ کام کرنے کی رفتار بہت سُست تھی۔ اس طرح کام کاج کرنے والیوں کو پھوہڑ کہا جاتا ہے۔ مجھے بھی پھوہڑ کہا گیا۔ ساس نے یہ بھی کہا کہ کالج کی تعلیم نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔ میرے خاوند نے چند ایک بار بڑے پیارے طریقے سے کہا کہ اُس کی ماں کو میرے خلاف کچھ بجا قسم کی شکایتیں ہیں۔ پہلے پہل تو میں نے کچھ نہ کہا۔ ایک بار ہنس کر ٹالا مگر ایک بار یوں ہُوا کہ میں اپنے کمرے میں بیٹھی اپنے دل پسند تصوّروں میں گم تھی۔ میں یہ نہیں بتاؤں گی کہ وہ تصوّر کیا تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ میں بیداری میں ایک بڑا ہی حسین خواب دیکھ رہی تھی۔

ساس کو شاید میری ہی کسی بات پر غصّہ آیا ہُوا تھا یا وہ میرے رویّے

سے تنگ آچکی تھی۔ اُس نے باہر سے بلند اور غصیلی آواز میں مجھے کہا ـــ "اری کہاں دفن ہو گئی ہو۔ باہر آؤ ذرا" ـــ میں بالکل اُسی طرح چونکی بلکہ بدک اُٹھی جس طرح کسی کو سوتے میں تھپڑ یا گھونسہ مار دیا جاتے۔ مجھے بیداری کے اتنے حسین خواب سے جگا دیا گیا تھا۔ قدرتی ردِّعمل یہ ہُوا کہ میں غصّے میں بھڑک کر اُٹھی اور باہر نکلی۔ ساس نے کہا ـــ "یہ کالج نہیں شریفوں کا گھر ہے ہمیں کسی نے اس گھر میں یوں شہزادیوں کی طرح نہیں بیٹھنے دیا تھا جیسے تم بیٹھ جاتی ہو۔"

"کیا قیامت آگئی ہے اس گھر میں؟" ـــ میں نے غصّے سے پوچھا ـــ "تم کسی کو کیا شہزادی بنا کر بٹھاؤ گی۔ دو لفظ پڑھے ہوتے تو تمہیں بات کرنے کی تمیز بھی ہوتی۔"

نتیجہ ظاہر ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ساس نے کیا کچھ کہا ہوگا، کیا کیا ہوگا۔ بہت تُو تُو مَیں مَیں ہُوئی۔ اس میں ساس بھی بے قصور تھی، مَیں بھی بے قصور۔ مجھے تصوّر پرستی نے نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔ جب کوئی پاگل بچّوں کو پتھر مارتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ بچّے چھیڑ کر اور اُس پر چیخ کر اُسے اُس دُنیا سے گھسیٹ لیتے ہیں جس میں وہ مگن اور مخمور ہوتا ہے۔ میں بھی شاید پاگل پن کی سرحد تک پہنچ گئی تھی۔ ساس نے مجھے بیدار کر دیا تو میں نے جوابی حملہ کر دیا۔ گھر کی فضا میں خاصی بے مزگی پیدا ہو گئی۔

اُسی رات خاوند نے مجھے کہا کہ میں نے اُس کی ماں کی بے عزّتی کی ہے۔ میں نے خاوند کو جلی کٹی سنا دیں۔ اُس نے غصّے کا جواب غصّے سے نہ دیا۔ تحمّل سے مجھے سمجھانے لگا مگر میں نے اُس کی سیدھی باتوں کے اُلٹے جواب دیئے اور اپنی ازدواجی زندگی میں کانٹے بکھیر دیتے۔ خاوند نے غصّے کا اظہار نہ کیا جس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بزدل تھا یا میرا غلام۔ یہ اس کے کردار کی پختگی اور عظمت تھی جو میں اُس وقت نہ جان سکی۔

بچّہ پیدا ہُوا تو میں نے اسے دلی طور پر قبول نہ کیا۔ میرا ذہن لڑکپن میں اٹکا ہُوا تھا جہاں سے میری عمر آگے بڑھ گئی تھی، ذہن وہیں کا وہیں تھا۔ وہ ماں میرے اندر ہی کہیں مر گئی تھی جس نے دسویں جماعت میں کہا تھا کہ پاکستان

کا ایک نشان حیدر میرا بیٹا ہوگا۔ اب میں ماں بن گئی تو میں بچّے کو قبول کرنے سے گھبرانے لگی۔ اس کو دودھ پلاتے کوفت ہوتی۔ اسے صاف کرتے گھن آتی۔ رات اسے اپنے پہلو میں لٹاتے مجھے بے چینی محسوس ہوتی۔ بچّے کے ساتھ میرا یہ سلوک سسرال والے کیسے برداشت کر سکتے تھے؟ بچّے کی دیکھ بھال میری ساس اور نند نے اپنے ذمّے لے لی۔ مجھے اس سے نہ شرمساری ہوتی نہ کوئی اور احساس بیدار ہوا۔ شاید مجھے اطمینان سا محسوس ہوا تھا۔

رسالے اور ناول میرے پاس چوری چوری آتے رہے۔ خاوند کو معلوم نہ ہوسکا۔ میں حقیقی زندگی سے دُور ہی دُور ہٹتی گئی۔ خاوند کو میں نے یوں مایوس کیا کہ وہ میرے ساتھ جو بے تکلفی پیدا کرنا چاہتا تھا وہ میں نے پیدا نہ کی کیونکہ وہ میرے تصوّروں بلکہ تصویروں والے مردوں کے جسم اور حُسن جیسا مرد نہیں تھا۔ اسے میں نے صرف اس حد تک قبول کیا تھا کہ میرے بچّوں کا باپ بن جاتے۔ بچّے کی پیدائش کے بعد خاوند مجھ سے کھچا کھچا سا رہنے لگا۔ وہ کہاں تک برداشت کرتا۔ اپنے بچّے کے ساتھ میرا یہ سلوک اُس کی برداشت سے باہر ہوگیا۔ سسرال گھر میں میرے ساتھ کوئی فرد بات کرتا تھا تو وہ کوئی بہت ہی ضروری بات ہوتی تھی جو میرے ساتھ انتہائی مختصر الفاظ میں کی جاتی تھی۔ لہجے میں بے رُخی ہوتی تھی۔ اس سے زیادہ اس گھر کی رونق کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔

جوں جوں اس گھر میں رہتے ہوئے اس گھر کے ساتھ میرا تعلق ٹوٹتا جارہا تھا میں اپنے تصوّروں میں آزاد ہوتی جارہی تھی۔ کچھ عرصے سے مجھے چھت پر جاکر گرد و پیش کی دُنیا دیکھنے کی عادت پڑگئی تھی۔ مجھے اب یاد آتا ہے کہ ادھر اُدھر کے مکانوں کی چھتوں پر مجھے دیکھنے والے موجود ہوتے تھے لیکن میں نے ان میں سے کسی کو کبھی دلچسپی سے نہیں دیکھا تھا۔ یہ تو میں جانتی تھی کہ کوئی آدمی، خصوصاً نوجوان، چھت پر کسی پردہ نشین لڑکی کو دیکھ لیتا ہے تو بڑے فخر سے اپنے دوستوں کو بتاتا ہے کہ اُس نے فلاں کی بیٹی، بیوی یا بہن کو دیکھا ہے۔ وہ اس طرح سناتا ہے جیسے اُس نے کوئی بے حد گہرا راز پا لیا

ہو۔ یوں تو ہوتا ہی ہے کہ بعض مرد اپنی چھتوں پر تاک جھانک کے لئے ہی چڑھتے ہیں۔ یہ عادت عورتوں میں بھی ہوتی ہے۔ گھر کی چار دیواری اور پابندیوں سے تنگ آئی ہوئی لڑکیاں چھتوں پر سیر کے لئے چڑھ جاتی ہیں۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتی بھی ہیں۔ بعض مرد اس وہم میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ فلاں لڑکی انہیں دیکھ رہی ہے۔ وہ اپنے دوستوں کو بتاتے اور اپنے سفلی جذبات کی تسکین کرتے ہیں۔ اس طرح بعض شریف لڑکیاں بدنام ہوجاتی ہیں۔ بدنام کرنے والوں کو سرور اور لطف محسوس ہوتا ہے۔

گھٹی ہوئی اس مخلوق نے میرے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ سب سے پہلے مجھے اپنی ماں نے بتایا کہ میرے متعلق عورتوں نے یہ مشہور کر دیا ہے کہ فلاں آدمی کو اپنی چھت سے دیکھتی ہوں اور وہ میرے لئے اپنی چھت پہ موجود ہوتا ہے۔ یہ سُن کر مجھے بہت غصّہ آیا۔ میں نے ماں کو بتایا کہ میں اُوپر جاتی ہوں لیکن کسی آدمی کو کبھی نہیں دیکھا۔ ماں نے مجھے اُوپر جانے سے منع کر دیا۔ کہنے لگی ——"تمہاری ساس پہلے ہی تم میں کیڑے نکالتی رہتی ہے۔ اگر اسے پتہ چل گیا تو طوفان لے آئے گی۔"

میری بد اخلاقی بدخیالی تک محدود تھی۔ حقیقی زندگی میں اپنے خاوند کے سوا میرا کسی مرد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں نے تصوّروں میں جن مردوں کے ساتھ تعلقات پیدا کر رکھے تھے ان جیسا مجھے کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے اپنے اڑوس پڑوس کی چھت پہ ایسا مرد کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اپنی ماں کو تسلّی دے لی تھی مگر چھت پر جانے سے باز نہ آئی۔

میرے بچّے کی عمر ایک سال ہوگئی۔ مجھے اتنا ہی احساس تھا کہ یہ میرا بچّہ ہے۔ میرے دل میں اس کے پیار کی تڑپ نہیں تھی۔ بچّہ میرے پاس کم ہی آتا تھا۔ میری ساس نے اسے اپنے ساتھ اتنا زیادہ لگا لیا تھا کہ وہ اسی کو اپنی ماں سمجھنے لگا تھا۔ بچّے کا باپ میرے ساتھ کھچا کھچا رہنے لگا تھا۔ میرے دل میں اس کی وہ محبت پیدا ہی نہیں ہوتی تھی جو بیوی کے دل میں خاوند کی ہوتی ہے۔ میں نے اسے مجازی خدا کا درجہ نہیں دیا تھا۔ وہ میرے ساتھ بے رُخی کرنے لگا

تو مجھے افسوس نہ ہوا۔ میں نے ایک روز اُسے کہا کہ میں اتنی جلدی دوسرا بچّہ پیدا نہیں کروں گی۔ اگر میں نے یہ تجویز محبت اور بے تکلفی کے رنگ میں پیش کی ہوتی تو خاوند قبول کر لیتا۔ میں نے جس انداز سے اُسے یہ بات کہی اس میں اکھڑپن تھا۔ میرے خاوند کو نہ میری تجویز پسند آئی نہ میرا انداز۔ اُس نے کوئی جواب ہی نہ دیا۔

معلوم ہوا کہ اُس نے میری خواہش کو مسترد کر دیا ہے۔ خاوند گھر کا حاکم ہوتا ہے، میرے خاوند نے بھی حاکم بننے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے صاف جواب دے دیا۔ کوئی خاوند اپنی بیوی کا یہ سلوک برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا خاوند مجھ سے پہلے ہی اُکتایا ہوا تھا، میرے نئے اعلان سے وہ مجھ سے لاتعلق ہو گیا مگر خاموشی سے نہیں۔ کہنے لگا — "میرا خیال ہے کہ تمہارے متعلق محلّے میں جو بات مشہور ہو گئی ہے وہ غلط نہیں۔"

میں نے چونک کر اُسے دیکھا۔ ابھی کچھ کہا نہیں تھا کہ وہ بولا — "میں خود بھی خاموش رہا اور اپنے گھر والوں کو بھی نہ بولنے دیا کیونکہ لوگوں کی عادت ہے کہ دوسروں کو بدنام کرتے ہیں۔ میری ماں کو بہت دِنوں سے معلوم ہے کہ تمہارے اس سلوک کی وجہ کیا ہے" — اس نے مجھے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ میں اُسے پسند نہیں کرتی اور میرے تعلقات اس آدمی کے ساتھ ہیں جسے میں چھت پر جا کر دیکھتی ہوں اور جب میں میکے جاتی ہوں تو اُسے ملتی ملاتی ہوں۔ خاوند نے مجھے کالج کے وقت کے طعنے دیئے اور آخر میں فیصلہ دیا کہ وہ مجھے کوئی اور موقع نہیں دے سکتا۔

گھروں میں اس طرح کی ناقابلِ برداشت صورت حال پیدا ہو ہی جایا کرتی ہے۔

اڑوس پڑوس کی عورتیں ہمدردی کے رنگ میں جلتی پر تیل ڈالتی اور تماشہ دیکھتی ہیں۔ جھگڑے کے جس فریق کے پاس بیٹھتی ہیں اُسے سچّا اور دوسرے فریق کو جھوٹا کہتی ہیں۔ لگائی بجھائی کرتی ہیں۔ اِدھر کی اُدھر، اُدھر کی اِدھر پہنچاتی ہیں اور چار دیواری کے مورچے سرگرم اور برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ میرے خاوند نے اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے بھی کہہ دیا کہ میں نہ اُس کے کام کی ہوں نہ گھر کے کام

کی بلکہ گھر کی بدنامی کا باعث بن رہی ہوں۔ گھروں میں ایسی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو عقل والے انسان حقائق کا جائزہ لے کر غلط فہمیاں دُور کر لیتے ہیں مگر میرا معاملہ کچھ اور تھا۔ میں حقائق کو سمجھنے والی لڑکی نہیں تھی۔ خاوند کے جھوٹے الزام نے میری تصوراتی دُنیا کو تہ و بالا کر دیا اور میں اُس پر برس پڑی۔

یہ حقائق سے فرار اور تصور پرستی کا نتیجہ تھا کہ میں نے الزام کو غلط ثابت کرنے کی بجائے جوابی حملہ کر دیا۔ میں نے کوئی حقیقی اور عقلی دلیل نہ دی۔ واہی تباہی بکی، اوٹ پٹانگ باتیں کہہ ڈالیں اور میرے مُنہ سے کچھ ایسے الفاظ نکل گئے جن سے الزام کی تردید نہیں بلکہ تصدیق ہوتی تھی۔ بات بگڑ گئی۔ سُسرال کا کوئی ایک بھی فرد میرے حق میں نہیں تھا۔ سب مجھ سے نالاں تھے۔ اُنہوں نے دیکھ لیا تھا کہ مجھ میں کوئی خوبی نہیں۔ وہ میرے نقائص برداشت کر سکتے تھے، اپنے خاندان کی بدنامی اُن کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔

سُسرال والوں نے شاید اپنی کانفرنس کی ہو گی۔ رات کو میرا خاوند دوسرے کسی کمرے میں سویا۔ صبح میرے پاس آیا اور بولا — "تم اپنے گھر چلی جاؤ" — اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔ میں اُس کے مُنہ کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے کہا — "میں یہ تو نہیں کہتا کہ تم اس گھر کے قابل نہیں ہو، میرا خیال ہے کہ یہ گھر تمہارے قابل نہیں ہے اور نہ میں تمہارے قابل ہوں" — میں نے اس سے پوچھا کہ وہ مجھے طلاق دے رہا ہے؟ اس نے جواب دیا — "اس کا فیصلہ بزرگ کریں گے۔ شریفوں کی اولاد خود فیصلے نہیں کیا کرتی" — اُس نے گھونٹ سا نگل کر کہا — "ہو سکتا ہے ہم دونوں کچھ عرصہ الگ رہ کر ایک دوسرے کی کشش محسوس کریں۔ میرا ضمیر صاف ہے۔ میں نے تم پر کبھی زیادتی نہیں کی تھی۔"

"اور میں نے آپ پر کیا زیادتی کی ہے؟" — میں نے پوچھا۔

اُس نے میرے پلنگ کے نیچے دیکھا۔ وہاں میرا ایک اٹیچی کیس رکھا تھا جس میں میری ذاتی چیزیں پڑی تھیں۔ میں جب اِدھر اُدھر ہوتی تھی تو اٹیچی کو تالا لگا دیا کرتی تھی۔ اُس وقت کُھلا تھا۔ اُس نے اٹیچی کو باہر گھسیٹا، کھولا اور کپڑوں کے نیچے سے ایک ناول نکالا۔ ناول میں دو فوٹو تھے۔ یہ مرد عورت کے ننگے فوٹو تھے۔ ناول

بھی انہی کی طرح ننگا تھا۔ میرا پسینہ نکل آیا۔ خاوند نے ناول اور فوٹو میرے آگے پھینک دیئے۔

"یہ ہے تمہاری زیادتی" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "یہ زیادتی تم نے مجھ پر کی ہے، اپنے بچّے پر کی ہے، میرے سارے خاندان پر کی ہے اور سب سے زیادہ اپنے آپ پر اور اپنے مستقبل پر کی ہے۔ جس طرح میرے ابّا جان ہم سب سے چوری ہماری کتابوں، ہمارے سوٹ کیسوں اور الماریوں کی تلاشی لیتے رہتے ہیں اسی طرح میں نے ایک ماہ پہلے تلاشی لی تھی۔ تمہارا اٹیچی کیس کھُلا تھا۔ اس میں یہ ناول اور فوٹو دیکھے۔ میرا خیال تھا کہ کوئی لڑکی تمہیں دے گئی ہے اور تم نے اسے کوئی اچھی کتاب سمجھ کر رکھ لی ہے۔ میں نے تم سے چوری تین بار تمہارا اٹیچی کھولا اور یہ ناول اور یہ فوٹو دیکھے ہیں۔ ان کی جگہ ہر بار بدلی ہوئی دیکھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تم چوری چوری پڑھتی ہو اور یہ فوٹو تمہیں پسند ہیں۔ تمہارا رویّہ بتاتا ہے کہ تمہارا دماغ اسی غلاظت نے تباہ کیا ہے۔ میں گریجویٹ ہوُں۔ میرے ابّا جان گریجویٹ اور تجربہ کار ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ذوق انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ تم وہاں سے بھی آگے نکل گئی ہو۔ تم میرا موازنہ ان آدمیوں سے کرتی ہو جو تم تصویروں میں دیکھتی ہو۔ تمہارے دل میں بچّے کا پیار بھی پیدا نہیں ہو سکا۔ یہ افیم اور چرس جیسا نشہ ہے ....میں تمہارے کردار پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔"

میں نے اُسے یقین دلانے کی بہت کوشش کی کہ میرا کردار متاثر نہیں ہُوا۔ اُس نے کہا کہ تمہارے کردار کی بنیاد ہی نہیں ہے۔ کردار اس سے بڑھ کر اور کیا خراب ہوگا کہ تمہارا جسم اس گھر میں ہے اور ذہن نہ جانے کہاں ہے۔

میں اپنے گھر چلی گئی۔ میرے ابّا جان کو پہلے ہی معلوم تھا کہ میں آ رہی ہوُں۔ مجھے دیکھ کر اُن کے آنسو نکل آئے۔ میری امّی رو رو کر بُرا حال کر رہی تھی۔ میرے بھائی اور بھابی نے مجھے یوُں دیکھا جیسے کوئی بن بلایا مہمان آ گیا ہو۔ میرے بچّے کو سُسرال والوں نے رکھ لیا تھا۔ میں نے بہت شور مچایا کہ مجھ پر جھوٹا الزام عائد کیا گیا ہے مگر کسی نے نہ سُنی۔ میری ساس اور نند نے سارے محلے اور برادری میں

مشہور کر دیا کہ مجھے بدکاری کے الزام میں طلاق دے دی گئی ہے۔ عورتوں کیا رہا ہمارے گھر کو چل پڑا۔ ہمدردی کے بدلے میں کہہ دیا گیا کہ یہ الزام کہاں تک صحیح ہے۔ یہ عورتیں میرے سُسرال کو گالیاں دیتی تھیں۔ میں جانتی تھی کہ یہی عورتیں میرے سُسرال جا کر کہیں گی کہ تم نے اچھا کیا اسے طلاق دے دی، لڑکی شکل سے ہی بدکار لگتی ہے، اس کی ماں بھی ایسی ہی تھی۔

جس صدمے نے مجھے سب سے زیادہ جھنجھوڑا، وہ یہ تھا کہ محلّے میں میری جو سہیلیاں تھیں ان میں سے ایک بھی میرے پاس نہیں آئی۔ میں نے ایک عورت کی زبانی دو کو بلایا۔ دونوں نے جواب بھیجا کہ انہیں ماں باپ نے میرے پاس آنے سے منع کر دیا ہے۔

میں نے ناول اور دونوں فوٹو چھت پر لے جا کر جلا ڈالے تھے مگر یہ اپنا کام کر چکے تھے۔ اس آگ نے میرا سہاگ اور میرے خاندان کی عزّت بھسم کر ڈالی تھی۔ میں اپنے ماں باپ کے گھر میں اجنبی نہیں اچھوت بن گئی۔ کہاں وہ دن کہ ابّا جان پیار سے پرانی باتیں سنایا کرتے تھے اور کہاں یہ دن کہ ابّا جان نے میرے ساتھ بات کرنا بھی گوارا نہ کیا۔ تین چار مہینوں بعد امّی نے کہا ـــــ "تمہاری عمر تو کچھ بھی نہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم ایک بچّے کی ماں ہو لیکن جسے جھوٹے الزام پر بھی طلاق مل جاتے اُسے کوئی قبول نہیں کرتا۔ دوسری شادی ناممکن ہو جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں لڑکی کا چال چلن ٹھیک نہیں۔"

لوگوں نے مجھے بدچلن کہا۔ جن کے اپنے چلن بد ہیں انہوں نے بھی مجھے بدچلن کہا۔ میں ذہنی اذیّت میں مبتلا ہو گئی۔ سزا بے حد ظالمانہ اور غیر انسانی تھی۔ میرے تصوّرات پگھلنے لگے۔ میں نیم پاگل ہو گئی۔ روتی رہی۔ راتوں کو جاگتی بھی رہی اور میں جب ذرا اپنے آپ میں آئی تو میرا ذہن پیچھے کو چل پڑا۔ مجھے جنسی لذت مہیا کرنے والے ناول، رسالے اور فوٹو نظر آتے اور ایک دن میں ماضی کے اُس مقام تک پہنچ گئی جہاں میں نے کہا تھا کہ پاکستان کا ایک نشانِ حیدر میرا بیٹا ہو گا۔ میرا جسم سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھا۔ یہ شاید شکست کا لرزہ تھا یا شرمندگی کا، مجھے اپنا بچّہ یاد آنے لگا۔ میرا ذہن وہیں اٹک

کے رہ گیا۔

آج تک میرا ذہن وہیں اٹکا ہوا ہے۔ میرا بچہ چار سال کا ہو گیا ہے۔ اب میں تصوروں میں تصویروں والے ننگے مردوں کو نہیں اپنے بچے کو دیکھا کرتی ہوں۔ دل میں ایک ہی خواہش ہے کہ اُسے لے آؤں اور اُسے وہیں کہانیاں سناؤں جو ابا جان مجھے سنایا کرتے تھے اور اُسے بتاؤں کہ تم جیسے ہزاروں بچے قربان کر کے قوم نے یہ پاک وطن حاصل کیا تھا۔ اب اس وطن پر تمہیں قربان ہونا ہے۔ مجھے اطمینان ہے کہ بچے کا باپ اُسے وہ بات بتا دے گا جو میں بتانا چاہتی ہوں۔ میرے بچے کا باپ پختہ شخصیت کا مرد ہے۔ میں نے اُس کی قدر و قیمت اور اُس کی عظمت کو اُس وقت سمجھا جب میں اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھی ہوں۔ چار سال گزر گئے ہیں۔ مجھے کسی نے بتایا ہے کہ اُس نے بچے کی خاطر دوسری شادی نہیں کی۔

اگر مجھے کہیں کہ میں اپنے جذبات اور احساسات کی کیفیت بیان کرتی چلی جاؤں تو جتنے ورق لکھ چکی ہوں اس سے دُگنے اور بھر دُوں گی لیکن کام کی بات جو مجھے کہنی ہے وہ یہ ہے کہ یہ آپ بیتی صرف میری نہیں، اور یہ کوئی حیرت انگیز آپ بیتی نہیں۔ یہ ہماری اُبھرتی ہوئی نسل کی وہ روداد ہے جو آپ کو شاید اور کوئی سنانے کی جرأت نہ کرے۔ اگر آپ کی بیٹی یا بیٹا گم صم رہتے ہیں، خلاؤں میں دیکھتے رہتے ہیں، انہیں بلاؤ تو ان کے مزاج بگڑ جاتے ہیں تو ان کی اس کیفیت کو نظر انداز نہ کریں۔ وہ اس زہرناک وبا کا شکار ہو گئے ہیں جس میں مبتلا ہو کر میں تباہ ہو چکی ہوں۔ اس وبا کو روکیں ورنہ دشمن سرحد پر کھڑا ہو کر للکارے گا — "اب پاکستان کی کوئی ماں نشانِ حیدر پیدا نہیں کر سکے گی۔"

ماں، ممانی اور مُنّی

ریل گاڑی کو اس سٹیشن پر بیس منٹ رُکنا تھا۔ ریلوے کے ملازم گاڑی کی چھتوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ تمام ڈبوں میں پانی ڈالا جا رہا تھا۔ میں اپنے ڈبے سے نکلا اور پلیٹ فارم پر آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ پاکستان کی عمر ابھی دو سال ہوئی تھی۔ میں انجن کی طرف چلا جا رہا تھا۔ میں زنانہ انٹر کلاس کے قریب سے گذرا تو نظریں اس ڈبے کی طرف گھوم گئیں۔ ایک جواں سال چہرہ نظر آیا۔ میں نے نظریں پھیر لیں لیکن کسی نے جیسے میری گردن پھر اس چہرے کی طرف گھما دی ہو۔ نہ رُکنے کے ارادے کے باوجود میرے قدم سُست پڑ گئے۔

اُس نے بھی مجھے دیکھا۔ اُس نے بھی نظریں پھیر لیں لیکن اُس کی بھی گردن کسی نے جیسے گھُما کر میری طرف کر دی ہو — ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور میں آگے جانے کی بجائے واپس اپنے ڈبے کی طرف چل پڑا۔ میں اب پلیٹ فارم پر نہیں، ماضی میں چلا جا رہا تھا۔ میں اپنی سیٹ پر جا بیٹھا لیکن میرا ذہن کہیں اور چلا گیا تھا۔ میں نے جس عورت کو انٹر کلاس میں دیکھا تھا، وہ مجھے چار سال پیچھے لے گئی تھی۔ اُس وقت اُس کی عمر چوبیس سال تھی۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب وہ میری دلہن بن کر میرے گھر میں آئی تھی۔ وہ بھولی بھالی، معصوم اور بڑی پیاری لڑکی تھی۔ چار سال بعد اُسے انٹر کلاس کے ڈبے میں بیٹھے ہوئے دیکھا تو بھی وہ ازدواجی زندگی کے پہلے روز کی طرح بھولی بھالی اور معصوم نظر آ رہی تھی مگر اُس کے چہرے پر اُداسی تھی۔ شاید گلے شکوے بھی تھے۔

گاڑی چل پڑی تھی۔ سٹیشن سے نکل کر اس کی رفتار تیز بھی ہو گئی تھی لیکن میرا

ذہن آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میں نے شادی سے پہلے بھی اُسے دیکھا تھا۔ وہ پردہ نہیں کرتی تھی۔ ایک ہی برادری تھی۔ دُور پار کی رشتہ داری بھی تھی۔ ایسی رشتہ داریوں کو ہم برانچ لائن کہا کرتے تھے۔ اس لڑکی کا نام تو کچھ اور تھا لیکن میں اُسے مُنّی کہا کرتا تھا کیونکہ جوانی میں بھی اُس کا چہرہ معصوم بچیّوں کی مانند تھا۔ عشق و محبت والی کوئی بات نہیں تھی۔ مُنّی مجھے بہت اچھی لگتی تھی اور میری خواہش یہی تھی کہ میری شادی اسی لڑکی کے ساتھ ہو۔

لڑکی لڑکے کی پسند کو گناہ سمجھا جاتا ہے۔ جس ملک میں حکومت بھی برادری سسٹم پر چل رہی ہو وہاں کسی کی ازدواجی زندگی کی خوشیوں یا بربادیوں کی کوئی اہمیت نہیں ہو سکتی۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسمبلیوں میں قوم کے جو نمائندے جاتے ہیں وہ برادریوں کے زور پر کامیاب ہوتے ہیں۔ برادری کے بہت سے لوگ خواہ اسے پسند ہی نہ کریں، انہیں برادری کے کھڑپینچوں کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ برادریوں کے رشتے ناطے بھی اسی طرح طے ہوتے ہیں۔ بعض والدین کسی اور گھرانے کو رشتہ دینا یا لینا چاہتے ہیں مگر رشتوں کا لین دین رشتوں کی پچھلی تاریخ اور لگے بندھے اصولوں کے مطابق ہوتا ہے۔ جوڑ ملے نہ ملے، شادی کر دی جاتی ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ لڑکی لڑکے سے تین چار سال بڑی ہے یا لڑکی تیرہ چودہ سال کی اور لڑکا چھبیس چھبیس سال کا ہے۔

اس حساب کتاب کے مطابق مُنّی کا رشتہ مجھے مِل گیا۔ میری دلی خواہش پُوری ہو گئی مگر میری ماں کی خواہش کچھ اور تھی۔ وہ اپنے بھائی کی بیٹی کو گھر لانا چاہتی تھی۔ یہ لڑکی نہ مجھے پسند تھی نہ میرے والد صاحب کو۔ لڑکی کوئی ایسی گئی گزری تو نہیں تھی، اُس کی ماں بدنیّت اور فسادن تھی۔ بظاہر خوش طبع تھی۔ ہنستی کھیلتی رہتی تھی لیکن اس کی مثال شہد کی مکھی جیسی تھی جو شہد تو دیتی ہے لیکن ڈستی بھی ہے۔ اس عورت کی ہنسی زہریلی تھی۔ وہ میرے ساتھ بہت پیار کرتی تھی جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ مجھے اپنا ہونے والا داماد سمجھتی تھی۔

ایک وجہ اور بھی تھی کہ وہ مجھے کیوں پسند کرتی تھی۔ میرے والد صاحب کی جائیداد مجھے مل رہی تھی۔ ہم برادری کے خوشحال لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ مُنّی کا رشتہ لینے کے سلسلے میں میرے والد صاحب نے برادری کی مخصوص سیاست کی چال چلی

تھی۔ دو بزرگوں کو درپردہ اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ انہوں نے میری ماں سے کہا تھا کہ وہ اُس کے بھائی کی بیٹی کو ہی لائیں گے۔ ماں مطمئن تھی مگر رشتہ مُنّی کا لیا گیا۔ میری ماں نے غم و غصّے کا مظاہرہ کیا۔ وہ بہت بھڑکی۔ اُس نے مُنّی کے چال چلن کو بھی مشکوک ظاہر کیا۔ اُس کی ماں کو بیٹی کا دلّال کہا اور جو منہ میں آیا کہہ ڈالا۔ میرے والد صاحب طبعاً بھلے مانس تھے لیکن اپنا فیصلہ منوانا جانتے تھے۔ ایک روز انہوں نے میری ماں کو گالیاں دیں اور غصّے سے گرج گرج کر اُسے چُپ کرا دیا۔ ماں کو چُپ لگ گئی۔ اُس کے بھائی کی بیوی کبھی کبھی مجھے کہا کرتی تھی کہ باپ نے تمہیں بہت بُرے گھر میں پھنسا دیا ہے اور یہ لڑکی تمہیں دھوکہ دے گی۔ میں نے اُس کی کبھی نہیں سُنی تھی۔ ہنس کر ٹال دیا کرتا تھا۔ میری ماں چُپ ہوئی تو وہ بھی چُپ ہو گئی۔

پھر میں مُنّی کی ڈولی لے آیا۔ لڑکے کی شادی کی سب سے زیادہ خوشی ماں اور بہن کو ہوتی ہے۔ میری کوئی بہن نہیں تھی۔ چھوٹے بھائی تھے۔ وہ اپنی بھابی کی آمد پر بہت خوش تھے۔ میری ماں اُداس یا ناراض تو نہیں تھی، اُس نے نئے کپڑے اور ڈھیر سارا زیور پہن رکھا تھا مگر اس میں وہ والہانہ پن نہیں تھا جو بہو کے آنے پر ماؤں میں دیکھنے میں آیا کرتا ہے۔ میں اُس وقت جوانی کے آغاز میں تھا جب جذبات غالب ہوتے ہیں اور دلہن کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔ میں دلہن میں مگن ہو گیا۔ اُس کے ساتھ میں رُومانی باتوں کے سوا کوئی اور بات ہی نہیں کرتا تھا۔ ہر دولہا، خواہ کتنا ہی بدصورت ہو، اپنی دلہن سے خواہ وہ کتنی ہی خوبصورت ہو، یہ سننے کے لیے بیتاب ہوتا ہے کہ دلہن اُسے دُنیا کا سب سے زیادہ خوبرُو مرد سمجھتی ہے اور شادی سے بہت پہلے سے اُسے چاہتی ہے۔ میں بھی ایسا ہی دُولہا تھا۔ بہت دن دلہن کی زبان سے یہی سُنتا رہا کہ میں اُس کی پسند کا دولہا ہوں۔ میں نے اس کے عوض اُسے یہ یقین دلایا کہ میں اُسی کو چاہتا تھا۔ اظہار کیے بغیر اس کی محبت کو دل میں پالتا رہا۔ میں نے اُسے یہ بھی بتا دیا کہ اُسے حاصل کرنے کے لیے میرے والد صاحب نے ایک سیاسی چال چلی اور میری ماں کو دھوکے میں رکھا تھا۔

میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا اور میں نے مان لیا کہ اُس نے بھی جھوٹ نہیں بولا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے دل میں اُتر گئے۔ میری یہی خواہش ہوتی تھی کہ مُنّی میرے پاس بیٹھی رہے۔ اُس کی ہر چیز مجھے اچھی لگتی تھی لیکن اُس کی بیساختہ ہنسی تو مجھ پر وجد طاری کر دیا کرتی تھی۔ وہ بچّوں کی طرح ہنسا کرتی تھی۔ ہم دونوں سمجھ بیٹھے تھے کہ زندگی ہنسی کھیل کا نام ہے۔ کام کرو اور ہنسو کھیلو۔ میں نے یہ روّیہ اختیار نہیں کیا تھا کہ روزمرّہ کے کام کاج اور ذمّہ داریوں سے جی چراؤ اور ازدواجی زندگی کے رُومانی پہلو کو ہی سامنے رکھو۔

میرا کام آسان نہیں تھا۔ زیرِ کاشت زمین اور مزارعوں کی نگرانی اور دوسرے جائیداد کی دیکھ بھال بہت مصروف رکھتی تھی۔ والد صاحب کو میں فارغ کر دینا چاہتا تھا۔ اس مشقّت سے فارغ ہو کر جب میں گھر آتا تھا تو مُنّی میرے نہانے کے لیے غسل خانے میں پانی رکھتی۔ چھاچھ یا دودھ کا پیالہ میرے سامنے لا کر رکھتی۔ میں کمرے میں بیٹھ جایا کرتا تھا تاکہ مُنّی میرے پاس آ کر بیٹھ جائے۔ وہ میرا مطالبہ جان گئی تھی اس لیے پُورا کرتی تھی۔ میرا سر سہلاتی۔ بچّوں کی طرح گال میرے گال سے لگاتی۔ میں تازہ دم ہو جایا کرتا تھا۔

میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں کہ یہ میں تھا جو مُنّی کو اپنے کمرے میں دن کے وقت بھی بٹھا لیا کرتا تھا۔ مُنّی نے مجھے کبھی نہیں کہا تھا کہ آؤ کمرے میں چل کے بیٹھتے ہیں۔

ازدواجی زندگی کا پانچواں یا چھٹا مہینہ تھا۔ مُنّی کا روّیہ بدلنے لگا۔ وہ ہنستی تو تھی مگر اُس کی ہنسی بُجھی بُجھی سی نظر آنے لگی۔ ایک روز میں باہر سے آیا تو مُنّی کی بجائے ماں دُودھ کا پیالہ لے کر آئی۔ میں نے پوچھا مُنّی کہاں ہے؟ ماں نے بڑبڑا کر کچھ کہا جو میں نہ سمجھ سکا۔ ماں بڑبڑائی اور کمرے سے نکل گئی۔ مجھے شک ہُوا جیسے ماں نے کوئی شکایت کی ہو۔ میں پریشان سا ہو گیا۔ مُنّی کو میں نے صحن میں غسل خانے کی طرف جاتے دیکھا۔ وہاں سے وہ میرے پاس آئی اور مُسکرا کر بولی ــ "نہائیں گے؟"

"آج کسی بہت ضروری کام میں مصروف ہو؟" ــ میں نے پوچھا۔

"ہاں جی!" ــ اُس نے جواب دیا ــ "امّی نے کہا تھا کہ ٹرنکوں سے گرم کپڑے نکال کر دھوپ میں پھیلا دو۔"

"آؤ، بیٹھو گی نہیں؟" ــ میں نے کہا

"نہیں" ــ اُس نے جواب دیا ــ "امّی نے کہا ہے کہ کوٹھے سے کپڑے اُتار کر لاؤ۔ وہ لے آؤں۔ تہ کرتے، ٹرنکوں میں رکھتے رات ہو جائے گی۔"

"کپڑے لے آ اُوپر سے" ــ میری ماں کی آواز سُنائی دی۔

مُنّی یہ حکم سُنتے ہی اُوپر چلی گئی۔ میں نے اُس روز اپنے روزمرّہ معمول میں یہ کمی محسوس کی کہ مُنّی میرے پاس بیٹھی نہیں۔ میری حالت اُس افیمی جیسی ہو گئی جسے افیم نہ ملی ہو۔ میں نے بالکل محسوس نہ کیا کہ میری ازدواجی زندگی میں دِق کے جراثیم داخل ہو چکے ہیں۔ میں نے رات کو یہ احمقانہ حرکت کی کہ مُنّی سے رُوٹھ گیا اور وہ بہت دیر مجھے مناتی رہی۔ نوجوانی میں ہر کوئی ایسے ہی کرتا ہے۔ مُنّی نے مجھے نصیحت کے لہجے میں کہا ــ "اب ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ ہر وقت چپکا ہُوا نہیں رہنا چاہیئے۔ مجھے اب گھر کے سارے کام سنبھالنے چاہیئں۔ امّی اکیلی لگی رہتی ہیں۔"

مجھے اس کی یہ نصیحت اچھی نہ لگی۔ میں نے اُسے کہا کہ اُسے ساری عمر گھر ہی سنبھالنا ہے۔ بچّے پیدا ہونے تک اُسے میرا خیال ویسے ہی رکھنا چاہیئے جیسے میں چاہتا ہوں۔ وہ تھوڑی دیر سنجیدہ رہی پھر ہنسنے لگی اور گلے شکوے رفع ہو گئے مگر اُس روز کے بعد اُس نے میرے پاس دن کے وقت کمرے میں بیٹھنا چھوڑ دیا۔ میں نے اُس کا یہ روّیہ قبول نہ کیا۔ دن گذرتے گئے اور مُنّی مجھ سے دُور ہٹتی گئی۔ ساری رات وہ میرے پاس ہوتی تھی۔ اُس کی محبت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا لیکن دن کے وقت اُس کا میرے پاس آ کر پہلے کی طرح نہ بیٹھنا مجھے بہت بُرا لگتا تھا۔

میں نے اُسے حکماً اپنے پاس بٹھانے کی کوشش کی تو اُس نے ہنس کر ٹالنا شروع کر دیا۔ مجھے غصّہ آنے لگا اور ایک رات وہ میرے کمرے میں آئی تو میں نے

اُسے کہا کہ وہ رات کو بھی مجھ سے دُور رہا کرے۔ اُس نے جب دیکھا کہ میں غصّے سے بے قابو ہُوا جا رہا ہوں تو اُس نے کہا "مجھے یہ بتا دیں کہ میں آپ کا حکم مانوں یا آپ کی امّی کا؟ وہ کہتی ہیں کہ ہر وقت اُس کے (میرے) ساتھ کمرے میں نہ گھسی رہا کرو۔ آپ کے آنے کا وقت ہوتا ہے تو وہ مجھے کسی نہ کسی کام میں لگا دیتی ہیں۔ اُن کی بات نہ مانوں تو وہ ناراض ہوتی ہیں۔ آپ کی نہ مانوں تو آپ خفا ہو جاتے ہیں۔ مجھے دونوں کو راضی رکھنا ہے۔ دن کو مجھے اُن کے ساتھ رہنے دیں، رات آپ کی ہے۔"

مُنّی کے لہجے میں کچھ اور ہی قسم کی سنجیدگی تھی جو میں نے اس میں پہلے نہیں دیکھی تھی۔ میں اُس کی پوزیشن سمجھ گیا۔ یہ اُس کی مجبوری تھی جسے میں نے قبول کر لیا۔ مجھے یہ خیال بھی آ گیا کہ میری ماں اس رشتے کے خلاف تھی۔ اب مجھے اور مُنّی کو ثابت کرنا تھا کہ رشتہ یہی بہتر تھا جو ہم نے اُس کی مرضی کے خلاف کیا ہے۔ میں نے مُنّی سے کہا کہ وہ میری ماں کا زیادہ خیال رکھے اور اُسے شکایت اور خفگی کا موقعہ نہ دے۔

دس بارہ روز بعد کا واقعہ ہے کہ میں گھر آیا تو چھوٹے بھائی نے مجھے بتایا کہ آج میری ماں اور مُنّی میں تُو تُو میں میں ہوئی ہے۔ والد صاحب گھر میں نہیں تھے۔ مُنّی سے رات کو پوچھا تو اُس کے آنسو نکل آئے۔ وہ کچھ بتا نہیں رہی تھی۔ میں نے غصّے سے پوچھا تو اُس نے کہا کہ میں اُس کی زبان سے اپنی ماں کے خلاف کچھ سُننا گوارا نہیں کروں گا۔ بہت کوشش کے بعد اُس نے ایسی باتیں بتائیں کہ میرا خون پہلے تو اُبالا پھر جیسے رگوں میں جم گیا ہو۔

"امّی کو اچھا نہیں لگتا کہ میں آپ کے پاس بیٹھا کروں۔" مُنّی نے کہا —— "وہ نہیں یہ بھی اچھا نہیں لگتا کہ آپ مجھ میں اتنی زیادہ دلچسپی لیں جتنی آپ لے رہے ہیں۔"

"کیا امّی نے تمہیں صاف کہا ہے کہ تم میرے پاس نہ بیٹھا کرو؟" —— میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" مُنّی نے کہا "ایسی باتیں صاف صاف نہیں کہی جاتیں۔ یہ سمجھنی پڑتی ہیں۔ آپ امّی سے پوچھیں کہ انہیں میرے خلاف کیا شکایت ہے۔ وہ کوئی

ٹھوس شکایت نہیں کر سکیں گی۔ وہ گول گول باتیں کرتی ہیں۔ طعنے دیتی ہیں۔ مجھ پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ میں پھوہڑ اور بدھو ہوں۔ آج انہوں نے مجھے یہاں تک کہہ ڈالا کہ تیری ماں میں شرم و حیا ہوتی تو وہ تجھے بتاتی کہ شریف لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں۔"

مختصر یہ کہ میری ماں نے مُنّی کو طعنے دیے اور وجہ پیدا کر کے مُنّی کو لڑائی جھگڑے پر مجبور کیا۔ مُنّی برداشت نہ کر سکی۔ میری ماں تو گول مول باتیں کر رہی تھی۔ مُنّی نے اُسے صاف صاف سُنا ڈالیں۔ میں نے مُنّی سے کہا کہ وہ برداشت کرنے کی کوشش کرے مگر مُنّی نے بتایا کہ وہ کئی مہینوں سے برداشت کر رہی ہے۔ وہ مجھے بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اُس نے مجھے التجا کے لہجے میں کہا کہ میں ماں سے پُوچھ کر اُسے بتاؤں کہ اُسے مُنّی کے خلاف کیا شکایت ہے تاکہ وہ آئندہ شکایت کا موقعہ پیدا نہ ہونے دے۔

میں نے ماں کے پاس بیٹھ کر اور برخورداری سے پوچھا کہ آج مُنّی نے کیا کیا ہے۔ ماں نے پہیلیوں کی زبان میں باتیں شروع کر دیں۔ میں نے اُسے کہا کہ میں کچھ بھی نہیں سمجھا۔ ماں نے کہا کہ اب تُو میری کیسے سمجھے گا؟ تُو نے اپنے اُوپر جس کا جادو سوار کر لیا ہے، اُس نے تجھے اس قابل نہیں چھوڑا کہ تُو کچھ سمجھے۔ ماں رُوٹھتی چلی گئی۔ اُس کی گول مول باتوں سے پتہ چلتا تھا جیسے مُنّی سے کوئی بڑا ہی گھناؤنا اور ناقابلِ معافی جرم سرزد ہو گیا ہے۔ میں پریشان ہو گیا۔ ماں بتا نہیں رہی تھی کہ وہ جرم کیا ہے۔

میں نے والد صاحب سے بات کی۔ اُنہوں نے بتایا کہ مُنّی کا جرم یہ ہے کہ وہ تمہاری بیوی بن کر آ گئی ہے۔ تمہاری ماں اپنے بھائی کی بیٹی کو لانا چاہتی تھی۔ اب وہ اس کوشش میں ہے کہ مُنّی کو اتنا پریشان کیا جائے کہ وہ بھاگ جائے۔

"آپ امّی کو سمجھائیں کہ مُنّی آ چکی ہے" —— میں نے کہا —— "اسے میں طلاق دے کر اپنے ماموں کی بیٹی کو نہیں لا سکتا۔"

"تمہاری ماں جانتی ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا" —— والد صاحب نے کہا —— "لیکن ہماری عورتیں دل کے چھالوں کا علاج ایسی ہی باتوں سے کیا کرتی ہیں

جیسی تمہاری ماں کر رہی ہے۔"

میری ماں نہ سمجھ سکی کہ وہ اپنے بیٹے کی خوشیاں تباہ کر رہی ہے۔ میری ممانی میری ماں سے زیادہ چالاک عورت تھی۔ وہ میرے ساتھ بہت پیار کیا کرتی تھی لیکن میری شادی مُنّی سے ہوگئی تو ممانی کا پیار بھی ختم ہوگیا۔ ماموں بھی مجھ سے کھچا کھچا رہتا تھا۔ میری ماں اُس کے گھر جاتی تھی اور جب ممانی ہمارے ہاں آتی تو میری ماں کے پاس بیٹھی کھُسر پھُسر کرتی رہتی تھی۔ میری ماں کا رویہ بگڑتا گیا اور گھر میں آئے دن ماں اور مُنّی کی تُرش کلامی ہونے لگی۔

میری ازدواجی زندگی کا ایک سال پُورا ہو چکا تھا۔ میری اتنی اچھی ازدواجی زندگی آسیب زدہ ہوگئی تھی۔ مُنّی کی ہنسی ختم ہوگئی۔ میرے دل میں رُومان مر گئے۔ ماں اور مُنّی کی بول چال بند ہو چکی تھی۔ اب مُنّی پر یہ الزام عائد ہوگیا کہ ایک سال گزر گیا ہے اور اُس میں بچہ پیدا ہونے کے آثار ظاہر نہیں ہوئے۔ مجھے ایسی کوئی شکایت نہیں تھی کہ مُنّی میں ماں بننے کے آثار کیوں ظاہر نہیں ہوئے۔ میں مُنّی کو بہلاتا رہتا تھا۔ اُس نے اپنے میکے کچھ زیادہ ہی جانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اُسے اجازت دے رکھی تھی کہ جب کبھی اُس کا دل اُداس ہو وہ اپنے گھر چلی جایا کرے۔ اُس کا میکہ گھر دُور نہیں تھا۔ دُوسری گلی میں تھا۔

ایک روز میرے والد صاحب نے مجھے بتایا کہ عورتوں میں مشہور ہو گیا ہے کہ مُنّی جو دوسرے تیسرے دن اپنے گھر چلی جاتی ہے، وہ ایک آدمی کی خاطر جاتی ہے جس کا اُس کے گھر میں کھُلا آنا جانا ہے۔ اس آدمی کو میں جانتا تھا۔ اچھے چال چلن کا نہیں تھا۔ اُس کی شکل و صورت اور اُس کے جسم میں خاصی کشش تھی۔ خاوند کو یہ بتایا جائے کہ اُس کی بیوی کسی اور میں دلچسپی لیتی ہے تو وہ مرنے مارنے پر اُتر آتا ہے۔ یہی حالت میری ہوگئی۔ میں جوان تھا۔ میں مالی اور جسمانی لحاظ سے کمزور نہیں تھا۔ میں نے طے کر لیا کہ مُنّی کو کچھ کہنے کی بجائے اپنے طور پر تفتیش کروں گا اور یہ بات سچ نکلی تو میں ان دونوں کو قتل کر دوں گا۔

دو تین روز بعد ایک رات مُنّی نے مجھے کہا۔ "میں آپ کو بھی بُری لگنے لگی ہوں؟"

"اگر تمہارا دل مجھ سے پھر نہیں گیا تو اپنے دل سے پوچھو"۔ میں نے کہا۔ "تمہیں جواب مل جائے گا ... تم نے یہ شک کیوں ظاہر کیا ہے؟"

اُس نے ایک عورت کا نام لے کر کہا۔ "آپ اُس سے ملتے ملاتے ہیں"۔

"تمہیں کس نے بتایا ہے؟" میں نے ایسے لہجے میں پوچھا جس میں غصہ تھا۔

"ایسی باتیں چھپی نہیں رہتیں .... آپ کو امّی نے مجھ سے بدظن کر دیا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ مجھے طلاق دے دیں"۔ اُس نے کہا۔

میں نے اُسے یقین دلانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانی۔ مجھے غصہ آ گیا۔ میں اُسے ابھی بتانا نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے متعلق کیا مشہور ہو گیا ہے۔ میں نے غصے سے بے قابو ہو کر اُسے کہہ دیا۔ "تم نے اپنی کرتوت پر پردہ ڈالنے کے لیے مجھ پر بدکاری کا الزام لگا دیا ہے؟ میں اندھا اور بہرہ نہیں۔ سب دیکھتا اور سُنتا ہوں"۔

اُس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر دبی دبی زبان میں بولی۔ "یہ آپ نے کیا کہہ دیا ہے؟"

"وہی کہا ہے جو تم نے مجھے کہا ہے"۔ میں نے کہا۔

اُس کے منہ سے سسکی کی طرح "اوہ" نکلی اور اُس کے آنسو بہنے لگے۔

میں مرد تھا۔ خاوند تھا۔ مرد جب خاوند بن جاتا ہے تو بیوی کو اپنی لونڈی سمجھنے لگتا ہے۔ میں اُس پر برسنے لگا۔ اُس کی زبان بند ہوگئی۔

"میرے خلاف آپ نے کیا سُنا ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"مجھے تمہارے جواب کی ضرورت نہیں"۔ میں نے کہا۔ "تمہیں بتا دوں گا"۔

اُس رات ہم کمرے میں اپنے اپنے پلنگ پر اس طرح سوئے جیسے کسی سرائے میں ایک دوسرے کے لیے اجنبی دو مسافر رات گزارنے کے لیے اکٹھے ہو گئے ہوں۔ میں نے صبح اُٹھ کر نہ اُس سے کوئی بات کی نہ ماں سے اور میں باہر نکل گیا۔ میرے سامنے اب دو مسئلے تھے۔ ایک یہ کہ مُنّی اور اُس کے چاہنے والے کی سراغرسانی کرنی تھی اور دوسرے یہ معلوم کرنا تھا کہ مُنّی نے مجھ پر اس عورت سے تعلق پیدا کرنے

کاالزام کیوں عائد کیا ہے۔ اس قسم کے ماحول میں جو ہماری ماؤں، ممانیوں وغیرہ نے
پیدا کر رکھا ہے اور جیسے برادری کی چپ پتا ہی حال ہے انسان ایسے ہی مسئلوں کو
اہمیت دیا کرتا ہے جیسے میں نے اپنے سامنے رکھ لیے تھے اور سوچنے کا انداز
بھی یہی ہوتا ہے جیسا میرا تھا عقلمند لوگ ایسی صورتِ حال میں یوں کرتے کہ ٹھنڈے
دل و دماغ سے معلوم کرتے کہ میرے اور مُنّی کے خلاف یہ بہتان کہاں سے اُٹھے ہیں۔
درپردہ یا کُھلے بندوں تفتیش کی جاتی، مگر میں چار دیواری کی دُنیا کے مردوں کی طرح غصّے
میں آگیا۔ میں برداشت نہ کرسکا کہ میری بیوی مجھ پر بدکاری کا الزام عائد کرے۔

مجھے جس عورت کے ساتھ منسوب کیا گیا تھا، وہ خوبصورت اور جوان عورت
تھی۔ اُس کا خاوند بھلا مانس اور عبادت گزار تھا۔ بیوی نے اُسے غلام بنا رکھا تھا۔
وہ کوئی ایسی خراب عورت نہیں تھی لیکن مُنہ پھٹ اور ہنسوڑ تھی۔ مردوں کے ساتھ
مذاق کرنے اور پھبتیاں کسنے سے بھی نہیں ڈرتی تھی۔ شادی کسی کی بھی ہو، کوئی بلائے
نہ بُلائے، وہ جاپہنچتی اور محفل کی رونق بن جاتی تھی۔ ناچتی تھی، گاتی بھی تھی اور ڈھولک
بھی بجاتی تھی۔ چار دیواری کی دُنیا میں ایسی عورت بدنام ہوجایا کرتی ہے۔ بیویاں اپنے
خاوندوں پر نظر رکھتی ہیں کہ اس عورت کے ساتھ بات نہ کریں اور مرد اس عورت کے
ساتھ دوستی کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ وہ جس کسی کو دھتکار دیتی ہے وہ
اُسے بدنام کرتا ہے۔

میرا اس عورت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ اُس کی عادتوں کی وجہ سے
میں اُسے پسند ضرور کرتا تھا۔ میں نے مُنّی کو یقین دلانے کی بجائے اُس پر جوابی حملہ
شروع کردیا اور ارادہ کرلیا کہ اُس کے خلاف تحقیقات کروں گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ
چند دنوں میں میری اور مُنّی کی اَن بن ہوگئی۔ میری ماں کا رویّہ یہ ہوگیا کہ مُنّی کے سامنے
مجھے ڈانٹ دیتی کہ میں اپنی بیوی کو بلاوجہ پریشان کرتا ہوں مگر اکیلے مجھے مُنّی کے
خلاف بھڑکاتی۔ اُس کا بھڑکانے کا انداز ایسا تھا کہ میں اس کا قائل ہوجاتا تھا۔
"آخر بچّی ہے"۔ ماں کہا کرتی۔ "اُس مسٹنڈے بدمعاش کی باتوں میں
آگئی ہے۔ لڑکی بُری نہیں۔ اُس کی ماں بہت خراب عورت ہے۔ اسی لیے میں
وہاں سے رشتہ نہیں لیتی تھی۔ تم زیادہ پریشان نہ ہُوا کرو۔ غصّہ بھی نہ کیا کرو۔ خود ہی

سمجھ جائے گی۔ ہے تو یہ بے غیرتی لیکن تمہاری بیوی تمہاری عزّت ہے۔ اندر اندر
سمجھ جائے تو اچھا ہے۔"

اس طرح میری ماں مُنّی کی تعریف بھی کیا کرتی اور یہ بھی کہتی کہ وہ اس مسٹنڈے
بدمعاش کے ساتھ گمراہ ہوگئی ہے۔ میں مرد تھا۔ میں اپنی بے عزّتی کیسے برداشت
کرسکتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں مُنّی کو طلاق دے دی اور اُسے اُس آدمی کے
ساتھ موقعہ پر پکڑنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ میرے دماغ میں قتل سما گیا تھا۔ ممانی
آتی تو وہ بھی مجھے ماں کی طرح بھڑکاتی تھی۔ اُس نے ابھی تک اپنی بیٹی کا رشتہ کسی
کو نہیں دیا تھا۔ اُس کے بھڑکانے کا انداز میری ماں جیسا پیارا ہوتا تھا۔

میرے والد صاحب کو تو چُپ ہی لگ گئی تھی۔ ماں انہیں بھی مُنّی کے
خلاف بھڑکاتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی وہ مجھے کہتے تھے کہ انہیں کچھ سمجھ نہیں آتی کہ یہ
طوفان کہاں سے اُٹھا ہے اور اس میں سچائی کتنی کچھ ہے۔

ایک روز مُنّی میرے ساتھ لڑ جھگڑ کر میکے چلی گئی۔ کچھ دیر بعد اُس کی
ماں ہمارے گھر آئی۔ اُس نے صحن میں کھڑے ہوکر میری ماں کو، میرے والد صاحب
کو اور مجھے جو سُنائیں وہ کوئی برداشت نہیں کرسکتا۔ اُس نے چِلّا چِلّا کر کہا کہ بیٹا تمہارا
بدکار اور بدمعاش ہے اور تم میری بیٹی پر تہمت لگاتے ہو۔ آؤ برادری میں بیٹھ
کر بات کرو۔ تم نے مجھ پر بھی بدکاری اور بدمعاشی کی تہمت لگائی ہے۔ اُس نے
ہم سب کو کنجر اور بدکار تک کہہ ڈالا۔ محلّہ اکٹھا ہوگیا۔

میری ممانی بھی آگئی۔ اُس نے میری ماں کے کندھے سے کندھا ملا کر میری
ساس کا مقابلہ کیا۔ یہ گالیوں، طعنوں اور الزامات کا تبادلہ تھا۔ مجھے غصّہ آیا تو میں
بے قابو ہوگیا۔ میں نے اُٹھ کر ساس کو دھکے دیئے اور اُسے باہر نکال دیا۔ وہ گئی
تو میرا سُسر، اُس کے دو بیٹے اور بیٹوں کا ایک چچا آگئے۔ انہوں نے میرے دروازے
پر آکر مجھے للکارا۔ میں کلہاڑی لے کر نکلا۔ میرے ساتھ صرف والد صاحب تھے۔
وہ لاٹھی لے کر نکلے۔ لوگ دوڑے آئے۔ اگر لڑائی ہوجاتی تو میں اور میرے
والد صاحب بُری طرح پٹ جاتے۔ لوگوں نے درمیان میں آکر خون خرابہ روک دیا۔
برادری نے دستور کے مطابق صلح صفائی کے لیے پنچایت بٹھائی۔ ہم سب

کو بلایا گیا۔ برادریوں میں اُس راضی نامے کو قبول نہیں کیا جاتا جس میں کسی کو سر
جھکانا پڑے۔ راضی نامے کے لیے دونوں فریق تیار رہتے ہیں مگر سر جھکانے اور
اپنی غلطی یا زیادتی کو تسلیم کرنے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں ہوتا۔ میرا اور میرے سسرال
کا رویہ یہی تھا۔ ایک دوسرے پر الزام عائد کیے گئے محفل گرم ہوگئی۔ زبانی کلامی
خوب لڑائی ہوئی۔ یہ کسی نے بھی نہ کہا کہ پہلے یہ تفتیش کرلی جائے کہ میرے اور مُنّی
کے متعلق بدچلنی کی جو باتیں مشہور ہوگئی ہیں اُن میں کچھ صداقت ہے یا نہیں۔

پنچایت کے بزرگ آسمان سے تو اُترے نہیں تھے، اسی برادری کے تھے۔
ان کے اپنے تعصبات بھی تھے۔ ان کی اپنی سیاست تھی۔ وہ سچے دل سے
راضی نامہ کرانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ صلح صفائی کی بجائے زبانی لڑائی ہوئی اور
پنچایت برخاست ہوگئی۔ غلط فہمیاں اور شکوک دشمنی کی صورت اختیار کرگئے۔
اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ مُنّی میرے گھر آئے گی یا میں اُسے لینے
جاؤں گا۔ میری اتنی خوشگوار ازدواجی زندگی تباہ ہوگئی۔

میری ماں نے مجھے کہنا شروع کردیا کہ میں اپنی جوانی تباہ نہ کروں اور
دوسری شادی فوراً کرلوں۔ اُس نے کہا "میں دشمنوں کے منہ پر ہاتھ پھیر کر
بتاؤں گی کہ میرے بیٹے کے لیے نیک اور شریف رشتوں کی کمی نہیں"۔ اسی قسم
کی باتیں کرکرکے ماں مجھے سسرال سے انتقام لینے کے لیے تیار کرنے لگی۔
والد صاحب بھی میری ماں کی باتوں میں آگئے۔

ایک روز ایک عورت نے میری ماں سے کہا کہ مُنّی کی ماں اور اُس کا باپ
اور اُس کے بھائی کہتے ہیں کہ دیکھیں گے کہ برادری کا کون سا گھر اُسے رشتہ دے
گا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس بدکار خاندان میں کوئی شریف گھرانہ اپنی بیٹی
نہیں دے گا۔ مجھے طیش آگیا۔ میں نے ارادہ کرلیا کہ فوراً دوسری شادی کردوں گا۔
ماں نے کہا کہ اُس کے بھائی نے اپنی بیٹی میرے لیے رکھی ہوئی ہے۔

اُدھر سے مجھے چیلنج ملنے لگے۔ آپ جانتے ہوں گے کہ چیلنج کس طرح ملا
کرتے ہیں۔ یہ براہِ راست نہیں آیا کرتے۔ جو بات اپنے دشمنوں کے کانوں
تک پہنچانی ہوتی ہے، وہ محلّے برادری کی ایک دو عورتوں سے کہہ دی جاتی ہے

اور ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اپنے تک ہی رکھنا، اُن تک نہ پہنچ جائے۔ مقصد
یہی ہوتا ہے کہ "اُن" تک ضرور پہنچے۔ یہ عورتیں یہ بات ہر گھر میں سُناتی اور یہ ضرور
کہتی ہیں کہ اپنے تک ہی رکھنا۔ "اپنے تک ہی رکھنے والی بات" عام باتوں
کی نسبت جلدی بلکہ بہت جلدی پھیلتی ہے۔ یُوں سمجھئے جیسے آپ نے اخبار میں
خبر چھپوادی۔

اسی طرح محلّے برادری کی عورتوں کی زبانی سسرال کے چیلنج ہمارے گھر تک
پہنچنے لگے۔ میری ماں اور ممانی نے مجھے کہا کہ انہیں شادی کرکے دکھا دو۔ بعض
اوقات مجھے مُنّی یاد آتی تو میرے دل کو بہت دُکھ ہوتا۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا جیسے
اُس کے خلاف میرے دل میں کوئی دشمنی نہیں اور اُس کی محبت میری رُوح میں محفوظ
ہے، مگر اچانک یاد آجاتا کہ اُس نے مجھے دھوکہ دیا اور مجھ پر بدکاری کی تہمت
لگائی ہے تو میرا دل کسی بڑے ہی سخت شکنجے میں جکڑا جاتا تھا۔

اُس کے ماں باپ اور بھائیوں کی طرف سے جب چیلنج ملنے لگے کہ ہماری
لڑکی کو طلاق دے کر دیکھ لے کہ اُسے کون اپنی بیٹی دیتا ہے تو میں نے مُنّی کو طلاق
دینے کا فیصلہ کرلیا لیکن میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ میں مُنّی کو طلاق نہیں دے سکوں گا
— اپنے سینے سے دل نکال کر کسی کُتّے کے آگے نہیں پھینک سکوں گا۔ سوچتے
سوچتے تین چار مہینے گذر گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھ میں طلاق نامہ لکھنے کی ہمّت
نہیں تھی اور جب یہ خیال آتا تھا کہ جسے میں نے دل کی ملکہ بنایا تھا اُس کی راتیں
اب کسی اور کے ساتھ گذریں گی تو میں بے تاب ہوکر ارادہ کرلیتا تھا کہ مُنّی کو طلاق
کی بجائے زہر دے دوں گا اور خود بھی زہر کھالوں گا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال
آجاتا کہ وہ تو بے وفا ہے۔ اس خیال سے مجھے سہارا ملتا اور یہ خوشی بھی کہ وہ
دوسرے خاوند کو بھی دھوکہ دے گی اور خوب بدنام ہوگی۔

آخر مجھ سے طلاق لکھوائی گئی۔ میں نے طلاق نامہ مع حق مہر اور کچھ فالتو رقم
اپنے سسرال بھیج دیا۔ انہوں نے طلاق نامہ رکھ لیا۔ حق مہر کی رقم اور فالتو رقم اس
پیغام کے ساتھ واپس کردی کہ ہم نے لڑکی بیچی نہیں تھی، نہ ہم تمہاری رقم کے بھوکے
ہیں۔ اس کے ساتھ انہوں نے کچھ طعنے بھی بھیجے۔ اگر میں مالی لحاظ سے یا جائیداد

کے لحاظ سے کمزور گھرانے کا آدمی ہوتا تو برادری میرا جینا حرام کر دیتی۔ میرے والد صاحب کی مالی حیثیت نے کسی کو بولنے نہ دیا۔

اب ماں اور ممانی میرے پیچھے پڑ گئیں کہ میں فوراً شادی کر لوں تا کہ دشمن یہ نہ کہیں کہ ہمیں کوئی رشتہ نہیں دیتا۔ ممانی کی بیٹی میری ہم عمر تھی۔ مُنّی جیسی خوبصورت تو نہیں تھی لیکن اُس کی شکل وصورت اور قد بُت میں کشش بہت تھی۔ ہنسنے کھیلنے والی لڑکی تھی۔ میں اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگا کہ اب یہ لڑکی اُس کمرے میں دُلہن بن کر آئے گی جس میں مُنّی آئی تھی۔ میرا دل نہیں مان رہا تھا۔

میں ماں اور ممانی کو آج کل پر ٹالتا رہا۔ میرے دل اور دماغ پر وہ آدمی بھی سوار تھا جس کے متعلق مشہور کیا گیا تھا کہ اُس کے مُنّی کے ساتھ تعلقات ہیں۔ میں نے اپنے دوستوں سے کہا تھا کہ اسے میں قتل کر دوں گا۔ دوست مجھے روکتے تھے۔ کہتے تھے کہ مُنّی نے تمہارے ساتھ بے وفائی کی ہے اور تم نے اُسے طلاق دے دی ہے۔ اب کوئی شریف اور باعزت گھرانہ اس کا رشتہ قبول نہیں کرے گا۔ وہ ساری عمر پچھتائے گی۔ میری اس سے تسلّی نہیں ہوتی تھی۔ مُنّی کو طلاق دے کر میرا دماغ میرے قابو میں نہیں رہا تھا۔ میری ماں اور ممانی نے مُنّی کے خلاف پروپیگنڈہ تیز کر دیا تھا تا کہ ہر کسی کو پتہ چل جائے کہ مُنّی بدمعاش لڑکی ہے اور کسی باعزت گھرانے کے قابل نہیں۔

طلاق دینے کے تین چار روز بعد کا واقعہ ہے۔ میں شام کے وقت اپنے کھیتوں سے واپس آ رہا تھا۔ راستے میں وہ آدمی کھڑا تھا جس کے ساتھ مُنّی کے تعلقات بتائے گئے تھے۔ وہ میرا ہم عمر تھا لیکن اُس نے ابھی شادی نہیں کی تھی۔ خوبرُو اور بے خوف آدمی تھا۔ اُسے دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ میں خالی ہاتھ تھا۔ میں یہ سوچتا ہُوا چلتا آیا کہ میں اُسے خالی ہاتھ کس طرح ختم کر سکتا ہوں۔

اُس کی بھی نیت ٹھیک معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ میرے راستے میں رُکا کھڑا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ میں اُس کے قریب پہنچا تو اُس نے مجھے روک لیا اور بولا — "کئی مہینوں سے سُن رہا ہوں کہ تم مجھے قتل کرو گے۔ میں ہر روز اور ہر رات تمہارا انتظار کرتا رہا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ تم رات کو مجھے سوتے میں قتل کرنے آؤ گے۔

تم نہ آئے۔ آج تمہیں اِدھر آتے دیکھا تھا۔ تمہارے لیے ہی یہاں کھڑا ہوں۔ قتل کرنا چاہو تو کر لو، لیکن میرے دوست! قتل کرنے کے لیے شیر کا دل چاہیے۔"

میں ابھی کچھ بھی نہ بولا تھا۔ اُس نے اپنے کُرتے کے اندر ہاتھ ڈالا اور نافسے لمبا سا چاقو نکال لیا۔ اُس نے چاقو کھولا۔ میں خالی ہاتھ تھا۔ مجھے چاقو سے بچنا، اُس سے چاقو چھیننا اور اُسے قتل کرنا تھا۔ میں یہ کہہ کر دو قدم پیچھے ہٹا— "آ جاؤ اور دیکھو کہ شیر کا دل کس کے سینے میں ہے۔"

وہ مُسکرایا اور بولا— "بے وقوف انسان! یہ لو چاقو اور مجھے قتل کر دو۔ میں تمہیں نہیں تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو۔ یہ لو چاقو۔"

اُس نے چاقو میرے پاؤں میں پھینک دیا۔ میں نے چاقو کو دیکھا، پھر اُسے دیکھا۔ اُس کی مُسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ میں نے چاقو نہ اُٹھایا۔ اُس نے مجھے بے وقوف انسان کہا تھا۔ میں واقعی بے وقوف بن گیا تھا۔ میں بُزدل نہیں تھا مگر میں اپنے آپ میں بزدلی محسوس کرنے لگا۔

"عورتوں کی باتوں پر کان دھرنے والے مرد عورتوں سے بدتر ہوتے ہیں"— اُس نے کہا— "تم تو ایسے نہیں تھے لیکن ماں اور ممانی نے تمہیں ہیجڑہ بنا دیا ہے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ تم زہرہ (مُنّی) کو طلاق دے دو گے۔ تم نے اپنی عقل اور اپنی مردانگی عورتوں کے قدموں میں رکھ دی اور ایک نیک اور پاک لڑکی کی زندگی تباہ کر دی۔"

"تم تو اُسے نیک پاک ہی کہو گے"— میں نے کہا— "اُس گھر میں تمہاری عیش بنی رہی ہے۔"

وہ گرج کر بولا— "تم بکواس کرتے ہو۔ تم مرد نہیں ہو ہیجڑے ہو۔ زہرہ میری منہ بولی بہن ہے۔ یہ حق میرا ہے کہ میں تمہیں قتل کر دوں۔ تم نے میری بہن کو بدنام کیا ہے، لیکن اس سے پہلے میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں تا کہ تم دھوکے میں نہ مارے جاؤ۔۔۔ نہ زہرہ بدچلن ہے نہ تم۔ نہ زہرہ نے تمہیں دھوکہ دیا ہے نہ تم نے اُسے دھوکہ دیا ہے۔ مجھے امید تھی کہ تم سمجھ جاؤ گے۔ تم تو اپنے آپ کو بڑا عقلمند اور جوانمرد سمجھتے ہو مگر تم میں عقل بھی نہیں اور دلیری بھی نہیں۔ اگر تم میں دلیری ہوتی

تو اپنی ماں کا مُنہ بند کرتے۔"

میں اُس کی باتوں سے حیران ہُوا جا رہا تھا۔ وہ مجھے بھی بے گناہ کہہ رہا تھا اور مُنّی کو بھی۔ میں نے اُسے کہا۔ "تم لڑنا چاہتے ہو یا مجھے کچھ سمجھانا چاہتے ہو؟"

"میں دونوں کام کر سکتا ہوں"۔ اُس نے جواب دیا۔ "اگر سچی بات سُننا چاہتے ہو تو میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ چاقو اُٹھا لو اور اپنے ہاتھ میں رکھو۔۔۔ مجھے کچھ باتیں اُس وقت معلوم ہوئی ہیں جب تم زہرہ کو طلاق دے چکے تھے۔ اگر مجھے پہلے پتہ چل جاتا کہ زہرہ کے دل میں تمہارے خلاف کس نے شک ڈالا تھا تو میں تمہیں بتا دیتا اور تم زہرہ کو طلاق نہ دیتے۔ یہ بشیراں کا کام ہے۔"

بشیراں وہ عورت تھی جس کے متعلق مُنّی نے مجھ پر تہمت لگائی تھی کہ میرے اُس کے ساتھ تعلقات ہیں۔

"تم جانتے ہو وہ آسمان سے تارے توڑ لانے والی عورت ہے"۔ اُس نے کہا۔ "اُسے تمہاری ممانی نے اُجرت دے کر کہا تھا کہ وہ زہرہ کے کان میں ڈال دے کہ اُس کے ساتھ تمہارے تعلقات ہیں۔ بشیراں نے اپنی ایک ہمراز سہیلی سے کہا کہ وہ زہرہ سے کہے کہ اُس کے خاوند پر بشیراں کا قبضہ ہے۔ اس سہیلی نے دوستی کا حق ادا کیا اور زہرہ کو یہ بات بتائی۔ زہرہ نے بشیراں سے پوچھا۔ بشیراں کو خاصی رقم ملی ہوئی تھی۔ اُس نے زہرہ سے کہا کہ تمہارا خاوند مجھ پر جان چھڑکتا ہے۔ زہرہ نے اپنی ماں کو بتایا۔ ماں نے ایک اور عورت کو بتایا اور بات پھیل گئی۔ زہرہ کو ہر عورت کی زبان سے یہی الفاظ سُنائی دینے لگے کہ اس لڑکی کا خاوند بشیراں کے قبضے میں ہے۔۔۔۔

"اس سے پہلے تمہاری ماں اور ممانی نے یہ جھوٹی خبر پھیلا دی تھی کہ زہرہ کے تعلقات میرے ساتھ ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ زہرہ کے دونوں بھائی میرے کتنے گہرے دوست ہیں؟ اتنے گہرے دوستوں کی بہنیں اپنی سگی بہنیں ہوتی ہیں۔ زہرہ میری منہ بولی بہن ہے اور وہ مجھے اپنا سگا بھائی سمجھتی ہے۔ میں اُن کے گھر جاتا ہوں لیکن تم کبھی یہ تو آ کر دیکھ لیتے کہ میں زہرہ کے پاس جاتا ہوں یا اُس کے بھائیوں کے پاس، اور زہرہ کے گھر میں، میں اور اُس کے بھائی بیٹھتے کہاں

ہیں۔ بشیراں نے یہ افواہ پھیلائی کہ زہرہ کا خاوند بشیراں کا مرید ہو گیا ہے اس لیے زہرہ نے اپنی دوستی لگا لی ہے۔۔۔۔

"تم جانتے ہو کہ لوگ کسی کی بدنامی کی خبر سُن کر یہ نہیں کہا کرتے کہ یہ خبر غلط بھی ہو سکتی ہے۔ وہ اس میں مرچ مسالہ لگا کر اسے اور زیادہ لذیذ بناتے اور اسے اور زیادہ پھیلاتے ہیں۔ تمہارے اور زہرہ کے معاملے میں بھی لوگوں نے یہی کیا۔"

"تم نے زہرہ کو بتایا ہے کہ مجھے بشیراں نے بدنام کیا ہے؟"۔ میں نے پوچھا۔

"اگر زہرہ کے ساتھ میری دوستی ہوتی تو میں اُسے بتاتا"۔ اُس نے کہا۔ "میں نے اُس کے بھائیوں کو اور اُس کی ماں کو بتا دیا ہے لیکن اب بتانے سے کیا حاصل؟ تم زہرہ کو طلاق دے چکے ہو۔"

"میں تم پر کس طرح یقین کر سکتا ہوں؟"۔ میں نے پوچھا۔ "تم کس طرح ثابت کر سکتے ہو کہ زہرہ کے ساتھ تمہارا درپردہ تعلق نہیں تھا؟"

"وکیلوں کی طرح باتیں نہ کرو"۔ اُس نے بشیراں جیسی ایک جوان عورت کا نام لے کر کہا۔ "میری اُس کے ساتھ دوستی ہے۔ لوگ ٹھیک کہتے ہیں کہ میں بدمعاش ہوں۔ یہ عورت بشیراں کے سینے میں چھپے ہُوئے راز جانتی ہے۔ بشیراں نے اُسے بتایا تھا کہ اُس نے تمہیں اور زہرہ کو پھاڑ دیا ہے۔ اس عورت نے مجھے اُس وقت بتایا جب تم طلاق دے چکے تھے۔ اُس سے میری ملاقات ہوئی تو اُس نے کہا کہ دیکھو دونوں بے قصور تھے مگر اُجاڑ دیے گئے۔ پھر اُس نے مجھے ساری بات سُنا دی۔"

"اب میں کیا کر سکتا ہوں؟"۔ میں نے کہا۔ "میں بشیراں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"قتل کرنا ہے تو اپنی ماں اور ممانی کو قتل کرو"۔ اُس نے کہا۔ "تمہاری ماں اپنے بھائی کی بیٹی کو گھر لانا چاہتی ہے۔ اگر تم میں ہمت ہے تو مجھ سے سُن لو کہ تمہاری ماموں زاد کیسی لڑکی ہے۔ وہ کنواری نہیں۔ ثبوت چاہتے ہو تو اُسے

ایک آدمی کے ساتھ دکھا دوں گا۔"

آپ تصور نہیں کر سکتے کہ یہ سُن کر میری کیا حالت ہوئی ہوگی۔ میں لمبی چوڑی کہانی نہیں سُناؤں گا۔ اُس نے مجھ پر ثابت کر دیا کہ میری ماموں زاد شریف لڑکی نہیں۔ میں نے چاقو اس آدمی کے حوالے کر دیا۔ وہاں سے اُٹھا اور سر جھکا کر چل پڑا۔ مجھے اُس کی آواز سُنائی دی "میں تمہیں اکیلا نہیں رہنے دوں گا۔ جہاں بلاؤ گے آؤں گا۔ چاہو تو بشیراں کو تمہارے سامنے کھڑا کر دوں گا۔"

رات کو ماں نے مجھے کہا کہ اُس کا بھائی آج بھی آیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ شادی جلدی ہو جانی چاہیے۔ اگر وہ میری ماں نہ ہوتی تو میں وہیں اُس کا گلا گھونٹ دیتا۔ میں نے اپنے اُوپر جبر کر کے کہا — "میں اس لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کروں گا۔"

ماں کی آنکھیں ٹھہر گئیں جیسے اُسے یقین نہ آیا ہو کہ میں نے اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ میں نے ایک بار پھر کہا کہ میں ماموں کی بیٹی کے ساتھ شادی نہیں کروں گا۔ ماں نے پہلے تو مجھے پیار سے سمجھایا، پھر اُس کے آنسو بہنے لگے اور پھر وہ واہی تباہی بکنے لگی۔ میرے والد صاحب دوڑے آئے۔ میری ماں نے انہیں کہا کہ یہ لڑکا برادری میں ہمیں ذلیل کرنے پر تلا ہُوا ہے۔ ماں روئے جا رہی تھی۔

"ابّا جان! آپ بچّے تو نہیں"۔ میں نے کہا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ امّی اپنی بھتیجی کو بہو بنا کر لانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے مُنّی کو طلاق دلا کر اپنی خواہش پُوری کی ہے۔"

میری ماں چیختی چلّاتی رہی۔ وہ مجھے بولنے نہیں دے رہی تھی۔ اُس کی کوشش بھی یہی تھی کہ میں نہ بولوں۔ میں نے جو چوٹ کھائی تھی، اس نے میرا دماغ خراب کر دیا تھا۔ میرے دل میں اب کسی کا احترام نہیں رہ گیا تھا۔ مجھے جو کچھ معلوم ہُوا تھا وہ میں نے کہہ سُنایا اور کہا کہ میں بشیراں کو یہاں لا کر اُس کے منہ سے یہ باتیں کہلواؤں گا۔ میں نے یہ بھی کہا — "اگر مجھے اس گھر میں دیکھنا چاہتے ہو تو ممانی اس گھر میں نہیں آئے گی"۔ مختصر یہ کہ میں نے گھر میں طوفان بپا کر دیا۔

بشیراں معمولی سے گھرانے کی عورت تھی۔ اُس کی ذات ہم سے کم تھی۔ اُس

کے خاوند کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ شریف آدمی تھا۔ میں اُس کے گھر چلا گیا۔ بشیراں اکیلی مل گئی۔ مجھے دیکھ کر جیسے خوشی سے اُچھل پڑی ہو۔ وہ تو میری بلائیں لینے پر آ گئی تھی۔

"بشیراں!" میں نے اُسے کہا "صاف صاف بتا دو کہ میرا گھر اُجاڑنے کے تمہیں کتنے پیسے ملے ہیں۔ اگر جھُوٹ بولو گی تو تمہاری اور تمہارے خاوند کی اتنی بے عزتی ہوگی کہ تمہارا جینا حرام ہو جائے گا۔"

وہ چالاک عورت تھی۔ اُس نے بھانپ لیا تھا کہ میں ٹلنے اور بخشنے کے لیے نہیں آیا۔ اُس نے مجھے بٹھا لیا۔ اُس کے پاس کوئی جادو تھا جس نے مجھ پر اثر کیا۔ میرا غصہ ٹھنڈا ہونے لگا۔ اُس نے جھُوٹ نہ بولا لیکن سارا الزام میری ماں اور ممانی پر عائد کیا۔ اُس نے تسلیم کر لیا کہ وہ بھی مُنّی کو بدنام کرتی رہی ہے لیکن اُس نے کہا کہ محلّے کی ہر عورت نے ایسی باتیں کہی ہیں جو وہ کہتی رہی ہے۔ اُس نے بھی ممانی کی زبانی یہ باتیں سُنی تھیں۔ اُس نے کہا "میں چونکہ غریب عورت ہوں اور میرا خاوند تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، اس لیے تم اس طرح میرے گھر میں آ دھمکے ہو جیسے مجھے قتل کر دو گے۔ تم اپنی ذات برادری کی حویلیوں میں کیوں نہیں جاتے؟ اپنی عورتوں کے منہ کیوں نہیں بند کرتے؟... تم میں اتنی ہمت اور جرأت نہیں۔"

"میں جو پوچھتا ہوں وہ بتاؤ"۔ میں نے اُونچی ذات والوں کی طرح حکم دیا۔

"تم ابھی بچے ہو"۔ اُس نے عجیب سی مسکراہٹ سے کہا "میں پُوری کوشش کروں گی کہ تمہارا رُعب قائم رکھوں، تم اپنا رُعب خود گنواؤ گے۔ ذرا اپنی ذات کی حویلیوں میں دیکھو وہاں کیا ہوتا ہے۔ اپنے ماموں کی بیٹی کی عشق بازیاں مجھ سے سُنو۔ کہو گے تو اُسے موقع پر ایک آدمی کے ساتھ تمہیں دکھا دوں گی.... اگر مجھ پر دھونس چلاؤ گے تو میں تمہارے ابّا جان کو منہ پر چل کر بتاؤں گی کہ تم لوگ کتنے نیک اور پاک ہو۔"

اُس کی اس بات نے مجھے چونکا دیا لیکن میں نے اپنا رُعب قائم رکھنے کے لیے کہا — "کیا بکواس کرتی ہو؟"

"تمہارے گھر میں اُس روز کوئی نہیں تھا جس روز میں وہاں گئی تھی" —

اُس نے کہا — "تمہارے ابّا جان اکیلے تھے۔ تمہاری شادی ہونے والی تھی۔ اُنہوں نے بڑے پیار سے مجھے پکڑ لیا اور اپنی گود میں بٹھا لیا۔ انہوں نے مجھے بیس روپے دیے جو میں نے لے لیے۔ چوہدری صاحب اپنے بڑھاپے کو بھول گئے۔ اُنہوں نے صرف یہ یاد رکھا کہ میں جوان اور خوشکل والی ہوں۔ اب بھی کہیں آمنا سامنا ہو جائے تو مُسکراتے اور مجھے کہیں ملنے کو کہتے ہیں ... تم میرے ساتھ بات کرنے آئے ہو تو آرام اور اطمینان سے کرو۔ اگر میری اور میرے خاوند کی بے عزّتی کرو گے تو اپنی اور اپنے خاندان کی بے عزّتی کراؤ گے۔ یہ کس نے مشہور کیا تھا کہ میرے ساتھ تمہارے تعلقات ہیں؟ میں نے تو اپنے آپ کو بدنام نہیں کیا تھا۔ یہ تمہاری ماں اور تمہاری ممانی کی کرتُوت ہے۔ تمہاری ممانی نے مجھے کپڑوں کا ایک جوڑا، ایک دوپٹہ اور پچاس روپے دیے اور کہا تھا کہ تم کسی سے یہ نہ کہنا کہ یہ بات غلط ہے اور زہرہ پر یہ ظاہر کرنا کہ تمہارے خاوند پر میرا قبضہ ہے۔"

"اور تم نے یہی ظاہر کیا؟"

"میں کہتی ہوں مجھ سے نہ پوچھو" — اُس نے کہا — "اپنے گھر جا کر اپنے باپ سے، اپنی ماں سے، اپنے ماموں اور اپنی ممانی سے اور اُن کی بیٹی سے پوچھو۔ کمزور پر ہاتھ اُٹھاؤ گے تو ذلیل ہو جاؤ گے۔ تم مجھے نہیں بخشو گے تو میں نہ تمہیں بخشوں گی نہ تمہارے خاندان کو۔ سب ننگے ہو جاؤ گے۔"

اُس کی زبان پردے اُٹھاتی چلی گئی اور میرا یہ حال ہوتا چلا گیا جیسے جسم سے خون خارج ہو رہا ہے اور میری طاقت ختم ہو رہی ہے۔ اُس نے یہ بتا دیا تھا کہ مجھ پر اور مُنّی پر تہمتیں تیری ممانی نے لگائی تھیں اور انہیں اُس نے تیری ماں کے ساتھ مل کر مشہور کیا۔ اس خوبصورت اور جوان عورت نے میری عقل اور میری مردانگی زائل کر دی اور میں سر جھکائے ہُوئے وہاں سے نکل آیا۔

میں نے گھر میں بات کرنی چھوڑ دی۔ نہ ماں سے بولتا تھا نہ والد صاحب سے۔ والد صاحب نے میرا اتنا سا ساتھ ضرور دیا کہ میری ماں کو بڑے رُعب سے کہتے رہے کہ اُس کے بھائی کی بیٹی اس گھر میں نہیں آئے گی۔ ایک روز

ممانی ہمارے گھر آئی تو اُس نے میری موجودگی میں اپنی بیٹی کی بات چھیڑ دی۔ اُس نے مجھے پیار سے کہا کہ میں اُس کی بیٹی کو قبول کر لوں۔

"وہ جس کی بیوی بنی ہوئی ہے اُسے اُسی کے حوالے کر دو" — میں نے پھٹ کر کہا۔

گھر میں ممانی نے ہنگامہ بپا کر دیا۔ ماں بھی میرے خلاف بولنے لگی۔ میں نے اُنہیں کھری کھری سُنا ڈالیں۔ والد صاحب نے مجھے بالکل نہ روکا بلکہ میرا ساتھ دیتے رہے۔ اُس روز کے بعد ممانی ہمارے گھر نہ آئی۔ معلوم ہُوا تھا کہ ماموں نے میرے والد صاحب سے شکوہ کیا تھا کہ میں اُس کی بیٹی کو بدنام کرتا ہوں۔ ماموں بھی ہم سے رُوٹھ گئے۔ مجھے اب کسی کے رُوٹھنے اور راضی ہونے کی پرواہ نہیں تھی۔ میں تو اب یہ سوچتا تھا کہ کسی کو قتل کر دوں یا اپنے آپ کو ختم کر دوں۔ مجھ میں مردوں والی دلیری ختم ہی ہو گئی تھی۔ شاید میرا دماغی توازن بھی بگڑ گیا تھا۔

پھر وہ دن بھی میری زندگی میں آیا کہ مجھے اطلاع ملی کہ مُنّی کی شادی کا دن مقرّر ہو گیا ہے۔ اُس کی شادی ایک اور قصبے میں ہو رہی تھی جو ہمارے قصبے سے تقریباً بیس میل دُور تھا۔ اپنے ہاں کسی نے بھی مُنّی کا رشتہ قبول نہیں کیا تھا۔ اُسے داغدار قرار دے دیا گیا تھا۔ اُس کا دوسرا نقص یہ بیان کیا گیا تھا کہ وہ بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ مجھے پتہ چلا کہ کسی کی معرفت دوسرے قصبے میں ایک معمولی سے گھرانے کے آدمی کو اُس کا رشتہ دیا گیا ہے۔

بارات آئی اور مُنّی چلی گئی۔ میں اپنا خون جلانے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکا۔ مجھے چُپ لگ گئی۔ برادری کے ساتھ میرا تعلّق ٹوٹ گیا۔ میرا دل مر گیا۔ دوستوں نے بہت کہا کہ میں اپنی زندگی تباہ نہ کروں اور شادی کر لوں۔ میں نے کسی کی نہ مانی۔ میرے ماں باپ کو اب مجھے شادی کے لیے کہنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ کام کاج میں بھی میرا دل نہیں لگتا تھا۔

آپ اسے میرے دماغ کی خرابی کہہ لیں یا کچھ اور کہہ لیں ایک رات مُنّی کے گھر چلا گیا اور اُس کی ماں کے پاؤں چُھو لیے۔ مُنّی کا باپ اور بھائی حیران ہوئے لیکن انہوں نے مجھے گھر سے نکالا نہیں۔ میں نے مُنّی کی ماں سے معافی مانگی اور

اُسے بتایا کہ مجھ میں اور مُنّی میں غلط فہمی کس طرح پیدا ہوئی تھی۔ اُس کی ماں کے آنسو بہنے لگے۔

"ہم نے جہاں بیٹی کا رشتہ دیا ہے وہاں وہ خوش نہیں رہ سکے گی"۔ مُنّی کی ماں نے کہا۔ "لیکن جوان بیٹی کو گھر بٹھائے رکھنا ٹھیک نہیں تھا۔ وہ مان نہیں رہی تھی۔ ہم نے اُس پر ظلم کیا ہے۔ یہ تمہاری ماں اور ممانی کی کرتوت کا نتیجہ ہے۔"

میں وہاں بہت دیر بیٹھا رہا۔ اُن لوگوں نے میری بہت عزّت کی۔ یہاں تک کہ میں وہاں سے اُٹھا تو مُنّی کے باپ نے کہا کہ کسی سے ذکر نہ کرنا کہ تم یہاں آئے تھے ورنہ برادری میں بدنام ہو جاؤں گا۔

ایک سال گزر گیا۔ اُس رات کو چار سال گزر گئے تھے جب مُنّی میری دلہن بن کر آئی تھی۔ وہ رات خواب کی طرح آئی تھی۔ میں نے طلاق کے بعد مُنّی کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ اُس کی شادی ہوئی تو اُس کے خاوند کو نہ دیکھا۔

اور وہ دن آیا جب میں ریل گاڑی سے اُتر کر پلیٹ فارم پر ٹہل رہا تھا تو زنانہ انٹر کلاس میں مجھے مُنّی بیٹھی نظر آئی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں نے مُنہ پھیر لیے لیکن دونوں نے پھر ایک دوسرے کو دیکھا اور میں اپنے ڈبّے میں جا بیٹھا۔ گاڑی لاہور شہر میں داخل ہوئی تو میرے سامنے یہ مسئلہ آ گیا کہ لاہور سٹیشن پر گاڑی رُکے تو مُنّی سے ملوں یا نہ ملوں۔ بہت سوچا مگر میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

گاڑی رُکی۔ میں اُترا تو میرے قدم اپنے آپ مُنّی کے ڈبّے کی طرف اُٹھ گئے۔ اُسے دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا اور مجھے خیال آ گیا کہ اُس کا خاوند اُس کے ساتھ ہو گا یا اُسے لینے آیا ہو گا۔ میں رُک کر اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ میں اُس کے پیچھے چلا گیا۔ باہر جا کر وہ تانگہ دیکھ رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں اٹیچی کیس تھا۔ میں نے پیچھے سے جا کر اُس کے ہاتھ سے اٹیچی کیس لے لیا۔ میں ہنسا نہیں، مُسکرایا نہیں، بے اختیار دل بھر آیا اور میں نے محسوس کیا کہ میں رو پڑوں گا۔

"اکیلی ہو؟" — میں نے پوچھا۔

اُس نے صرف سر ہلایا۔ وہ اکیلی تھی۔ مجھے یاد آ گیا کہ کسی نے بتایا تھا کہ اُس کا خاوند لاہور میں ملازم ہے۔

"وہ تمہیں لینے نہیں آیا؟" — میں نے پوچھا۔

"اُسے میں نے اطلاع نہیں دی تھی"۔ اُس نے کہا۔ "آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟"

"بات کرنے کا موقع دو تو سب کچھ بتا دوں گا"۔ میں نے کہا۔ "میں جو سزا بھگت رہا ہوں وہ بھی بتاؤں گا۔ تم تانگے میں بیٹھو اور جاؤ۔ تمہارے خاوند نے دیکھ لیا تو تمہارے لیے اچھا نہیں ہو گا۔"

"وہ دیکھ ہی لے تو اچھا ہے"۔ اُس نے کہا اور اُس کی آہ نکل گئی۔

میں نے محسوس کر لیا کہ وہ مجھ سے بھاگ نہیں رہی۔ میں لاہور سے اچھی طرح واقف تھا۔ جب سے میں نے مُنّی کو طلاق دی تھی، میں بہت دفعہ لاہور گیا تھا اور ہر دفعہ تین چار دن وہیں ہوٹل میں رہا تھا۔ میں انارکلی کے دِلّی ہوٹل میں ٹھہرا کرتا تھا۔ روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ لاہور میں سینما دیکھتا اور سیر سپاٹا کیا کرتا تھا۔ دل کو دھوکہ دینے کا یہی ذریعہ تھا۔ اب میں لاہور سیر کے لیے ہی گیا تھا۔ مُنّی مل گئی اُس سے پوچھا کہ وہ میرے ساتھ ہوٹل میں چلے گی؟ وہ مان گئی۔

ہوٹل میں جا کر کمرہ لیا اور ہم دونوں اندر بیٹھ گئے۔ مُنّی پہلی بار ہوٹل میں آئی تھی اس لیے گھبرا رہی تھی۔ میں نے جب بات شروع کی تو اُس کی گھبراہٹ دُور ہو گئی۔ بات تو میں نے بعد میں شروع کی تھی، پہلے تو میرے آنسو جاری ہو گئے، پھر میری سسکیاں نکلنے لگیں۔ مُنّی نے میرے پاس آ کر میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور میرے بال سہلانے لگی۔

"مجھے دیر سے پتہ چلا تھا کہ ہم دونوں کو کس نے بدنام کیا اور ہم میں غلط فہمی پیدا کی تھی"۔ — مُنّی نے کہا۔ "اگر میں آزاد ہوتی تو دوڑتی آپ کے پاس آ جاتی مگر ماں باپ اور بھائیوں نے اسے اپنی ناک کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ آپ کی ماں اور ممانی ہمیں طعنے اور دھمکیاں بھیجتی رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ میرے ماں باپ نے اُسی

وقت میری شادی کی کوشش شروع کر دی۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ ہمارے گھر گئے تھے اور آپ نے میری ماں کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگی تھی۔"

"میں تم سے بھی معافی مانگنا چاہتا ہوں"۔ میں نے کہا اور بے قابو ہو کر اسے اپنے بازوؤں میں لیا اور گود میں بٹھا لیا۔

مجھے بشیراں سے اور اُس آدمی سے جس نے مُنّی کو مُنہ بولی بہن بنا رکھا تھا' جو باتیں معلوم ہُوئی تھیں، وہ مُنّی کو سُنائیں۔ اُس نے کہا کہ اُسے سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ میں نے اپنی ماں اور بھائی کی بے عزتی کی تھی۔

"شادی نہیں کریں گے آپ؟" — مُنّی نے پوچھا۔

"تمہاری طرح بے وفائی نہیں کروں گا" — میں نے جواب دیا — "رشتے ملے تھے، میں نے انکار کر دیا ہے۔ تمہاری جگہ آسمان کی کوئی پری بھی نہیں لے سکتی۔"

"آپ مرد ہیں"۔ اُس نے آہ بھر کر کہا — "آپ بغاوت کر سکتے ہیں۔ مجھے زبردستی اس آدمی کے حوالے کیا گیا ہے۔ میرے ماں باپ اور بھائی آپ کو بتانا چاہتے تھے کہ میرے لیے رشتوں کی کمی نہیں۔ برادری سے کوئی رشتہ نہ ملا تو کسی کے کہنے پر انہوں نے مجھے اس کے ساتھ بیاہ دیا۔ میرا خاوند یہاں ملازم ہے میں کچھ نہیں بتاتی۔ اسے آپ دیکھیں گے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ کیسا ہے۔ اُسے خدا نے جیسی شکل دی ہے ویسا ہی اُس کا اخلاق ہے۔ تنخواہ تھوڑی ہے اور یہ جُوا کھیلتا ہے۔ بعض راتیں گھر آتا ہی نہیں۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ میرے ماں باپ اور بھائیوں نے اپنی ناک کی خاطر مجھے سُولی چڑھا دیا ہے۔"

"اس سے طلاق لے سکتی ہو؟"

"پھر کیا ہو گا؟" — اُس نے پوچھا۔

"پھر میں تم سے شادی کر لوں گا۔"

"کون کرنے دے گا شادی؟" — اُس نے پوچھا۔

"اللہ مالک ہے" — میں نے کہا — "میں نے برادری کو دیکھ لیا ہے۔ مجھے برادری کا کوئی ڈر نہیں۔ تم طلاق لینے کی کوشش کرو۔"

ہم بہت دیر طریقے سوچتے رہے اور مُنّی کو میں نے تانگے میں بٹھا کر بھیج

دیا۔ وعدے کے مطابق وہ دوسرے دن آ گئی۔ یہ اُس کے خاوند کے دفتر کا وقت تھا۔ وہ خاصی دیر میرے ساتھ رہی۔ اُس نے اپنے خاوند کی کچھ اور باتیں بتائیں میں اُس کے ساتھ اُس کے گھر تک گیا اور گھر دیکھ کر آ گیا۔

رات کو میں پھر اُس کے گھر چلا گیا۔ اُس کا خاوند عادت کے مطابق باہر نکل گیا تھا۔ میں اُس کے خاوند سے ہی ملنے گیا تھا۔ میں مُنّی کے پاس بیٹھ گیا ہم باتیں کرتے رہے اور آدھی رات ہو گئی۔ اس سے کچھ دیر بعد اُس کا خاوند آیا۔ گہرے سانولے رنگ کا بدصورت سا آدمی تھا۔ مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں اُسے بازو سے پکڑ کر باہر لے گیا۔

"کیا تم اپنے آپ کو اس بیوی کے قابل سمجھتے ہو؟" — میں نے اُس سے پوچھا — "کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ کتنے اونچے اور کتنے امیر خاندان کی بیٹی ہے؟"

وہ تو مٹی کا مادھو نکلا۔ مجھے افسوس ہُوا کہ مُنّی کے ماں باپ نے میرے خاندان پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اُن کی بیٹی کے لیے رشتوں کی کمی نہیں بیٹی کس کے ساتھ باندھ دی تھی۔ میں نے اُسے بتایا کہ اس لڑکی کی شادی اس کے ساتھ کیسے ہو گئی ہے۔

"تم اپنی شکل دیکھو" — میں نے کہا — "اپنی حیثیت دیکھو۔ یہ بیوی تمہارے ساتھ خوش نہیں۔ پیشتر اس کے کہ یہ تمہیں دھوکہ دے تم اسے طلاق دے دو۔ تم جُوا بھی کھیلتے ہو۔"

"مجھ سے غلطی ہوئی ہے کہ میں نے اتنے بڑے گھر کی لڑکی کے ساتھ شادی کر لی ہے"۔ اُس نے کہا — "میری تنخواہ تھوڑی ہے اور جُوا صرف اِس لیے کھیلتا ہوں کہ میں بھی امیر بن جاؤں۔ اس تھوڑی سی تنخواہ میں سے مجھے ماں باپ کو بھی پیسے بھیجنے پڑتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ بیوی مجھ سے مطمئن نہیں چُپ چاپ اور اُداس رہتی ہے۔"

"میں نے تمہیں حل نکال دیا ہے" — میں نے کہا۔

"مجھے تین چار دن سوچنے دو" — اُس نے کہا۔

میں وہاں سے چلا آیا اور تین چار روز بعد اُس کے گھر گیا۔ مُنّی اکیلی تھی اُس

نے بتایا کہ اُس کا خاوند تیس ہزار روپیہ لایا ہے اور اُس کی گردن تکبّر سے اکڑی ہوئی ہے۔ اُس نے مُنّی کو یہ نہ بتایا کہ یہ رقم کہاں سے آگئی ہے۔

وہ رات حسبِ معمول دیر سے آیا اور مجھے دوسرے کمرے میں لے جا کر کہنے لگا کہ مجھے اتنا بے غیرت نہ سمجھو کہ بیوی کو طلاق دے دوں گا۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ پھر کبھی اس گھر میں نہ آنا۔ میں نے اُسے دھمکی دی اور وہاں سے چلا آیا۔ اگلی شام مُنّی گھبرائی ہوئی ہوٹل میں آئی۔ اُس نے بتایا کہ پولیس نے اُس کے گھر کی تلاشی لی ہے اور رقم برآمد کر کے اُس کے خاوند کو ہتھکڑی لگا کر لے گئی ہے۔ میں سمجھ گیا کہ اُس نے یہ رقم غبن کی تھی۔ وہ امیر بنتے بنتے رہ گیا۔

مُنّی نے اپنے ماں باپ کو خط لکھا۔ اُس کا باپ اور بھائی آگئے۔ میں ان سے مِلا۔ پولیس سے پتہ کرایا۔ معلوم ہُوا کہ وہ غبن میں پکڑا گیا ہے اور اُس کے قید سے بچنے کا کوئی امکان نہیں۔ اُسے جیل کی حوالات میں بھیج دیا گیا۔ میں اُسے جیل میں مِلا اور اُس کے ساتھ ایسی باتیں کیں کہ اُس نے طلاق لکھ دی۔ مُنّی کے باپ اور بھائیوں کے لیے یہ دُوسرا ماتم تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ میری بات مان گئے اور برادری نے یہ عجیب و غریب خبر سُنی کہ میں نے مُنّی کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ بہت باتیں بنیں۔ ہم نے پرواہ نہ کی۔ میں ماں باپ سے الگ ہو گیا۔

ہمارا پہلا بیٹا جوان ہو گیا ہے۔ ایک روز مُنّی نے مجھے کہا "میں اپنے بیٹے کے لیے اپنی بھائی کی بیٹی لاؤں گی۔"

میں نے بدک کر مُنّی کو دیکھا اور کہا "مُنّی! اپنے بیٹے سے پوچھ لو۔ میری ماں بھی بھائی کی بیٹی کو بہو بنانا چاہتی تھی۔"

"اُسی نے کہا ہے" مُنّی نے جواب دیا۔

خدا کا شکر ہے کہ میرے بیٹے کو یہی لڑکی پسند ہے، ورنہ میں یہ کہانی ازسرِنو شروع کرنے سے گھبرا رہا تھا۔

نیکی کا صِلہ جو مجھے مِلا

آپ بیتی جو میں آپ کو سنا رہا ہوں یہ ہمارے معاشرے کے اُن عناصر کی کہانی ہے جو ایک عورت کو تباہی کے راستے پر ڈالتے اور گھروں کو اُجاڑتے ہیں۔ میں ہمدردی اور دادرسی کا طلب گار نہیں۔ میں لڑکپن میں اپنے خاندان کے ساتھ مشرقی پنجاب سے ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا۔ ہم سب اپنی صرف جانیں اور پہنے ہوئے کپڑے اپنے ساتھ لائے اور دل میں پاکستان کی محبت تھی۔ یہاں آکر میں نے میٹرک پاس کیا پھر بی۔ اے کیا۔ سی کام کیا اور ملازمت مل گئی۔ والد صاحب بھی سرکاری ملازمت میں تھے۔ ہم فارغ البالی کی زندگی بسر کرنے لگے۔

وہ بھی مہاجروں کا خاندان تھا جس کی ایک لڑکی کے ساتھ میری شادی ہوئی۔ اس گھرانے میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی اور آمدنی اتنی محدود کہ دال روٹی بھی پوری نہیں ہوتی تھی۔ غربت اور کثرتِ اولاد نے گھر میں گھٹن پیدا کر رکھی تھی۔ ماں باپ کو یہ غم کھاتے جا رہا تھا کہ مسئلہ صرف پیٹ بھرنے کا نہیں لڑکیوں کو ٹھکانے لگانے کا ہے۔ اس غم نے ایسی فضا پیدا کر رکھی تھی کہ بچوں میں کئی طرح کی محرومیاں پیدا ہو گئیں جن میں پیار اور شفقت کی محرومی زیادہ تھی۔ اس کیفیت نے جذباتی گھٹن پیدا کر دی۔

شادی سے پہلے اس گھرانے کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہمیں اتنا ہی بتایا گیا تھا کہ یہ لوگ مہاجر ہیں اور بہت غریب ہیں۔ میرے والدین کو

اور مجھے بھی یہی دو باتیں پسند آئیں۔ مہاجر گھرانے کی سب سے بڑی مدد یہی ہو سکتی تھی کہ اُن کی بیٹیوں کی شادیاں جہیز اور بے معنی رسومات کے بغیر ہوجائیں۔ یہی مقصد تھا جس کے لئے میرے والدین نے اس گھرانے کی ایک لڑکی کے ساتھ میری شادی کر دی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ شادی ہوئی ہے۔ کوئی جہیز نہیں تھا۔ ہم لڑکی کو تانگے میں بٹھا کر لے آئے۔ لڑکی کی شکل وصورت اچھی تھی۔ باتیں زیادہ کرتی تھی۔ اس سے ہم اسے ذہین اور سمجھ دار سمجھے۔ جُوں جُوں دن گزرتے گئے وہ باتونی ہوتی چلی گئی اور تیز طرار بھی۔ وہ غصے میں جلدی آجاتی اور کچھ دیر بعد غصہ ختم ہو جاتا تھا۔ اس عادت کی وجہ سے میں اسے جذباتی کہا کرتا تھا۔

میرا ضمیر مطمئن تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کر کے میں نے نیکی کی ہے اور اس کے والدین کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے۔ میں نے یہ خیال بھی رکھا کہ غریب گھرانے کی لڑکی ہے اس لئے میرے مُنہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جسے وہ غلط سمجھ کر دل میں یہ وہم رکھ لے کہ میں نے اُس پر طنز کی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ لڑکوں والے رشتہ مانگتے وقت یہ ضرور کہا کرتے ہیں کہ ہمیں جہیز نہیں چاہیئے۔ شادی دو دِلوں کا سودا ہوتا ہے۔ اور اگر اِن باتوں میں آکر کسی لڑکی کے والدین جہیز رسمی سا دے بیٹھیں تو سُسرال میں لڑکی کو یہ طعنے سُننے پڑتے ہیں کہ لے کے کیا آئی تھی! ماں باپ نے تین کپڑوں میں ڈولی میں بٹھا دی۔

میرے گھر میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ البتہ میری والدہ چونکہ جہاندیدہ عورت تھیں اس لئے کہا کرتی تھیں کہ لڑکی کو چھوٹے بڑے اور اچھے بُرے کی تمیز نہیں۔ زبان دراز ہے۔ میں نے توجہ نہ دی۔ مجھے توقع تھی کہ چونکہ یہ گھُٹے ہوئے ماحول کی پیداوار ہے اس لئے ہمارے ماحول کو سمجھ نہیں سکتی کہ کس کے ساتھ کس طرح بات کرنی ہے، آہستہ آہستہ سمجھ جائے گی۔

والدین اپنے شادی شدہ بیٹوں کو اپنے ساتھ ہی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن مجھے والد صاحب نے کہا کہ میں اپنے محکمے سے قرض لے کر

کہیں پلاٹ لے لوں اور اپنا مکان بنا لوں۔ چنانچہ میں نے کچھ قرض لیا اور ایک پلاٹ مل گیا۔ اس پر میں نے ایک کمرہ کھڑا کر کے چار دیواری بنالی اور بیوی کو لے کر اس میں رہنے لگا۔ اُس وقت تک میں تین بچّوں کا باپ بن چکا تھا۔ میری بیوی نے اڑوس پڑوس میں راہ ورسم پیدا کر لی۔ میرے ساتھ اس کا سلوک اچھا رہا۔ میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ وہ پڑوسنوں کے ہاں جا کر گپ شپ لگانے میں زیادہ دلچسپی لیتی تھی۔ بچّوں میں اُس کی اتنی دلچسپی نہیں تھی جتنی ماں کو ہُوا کرتی ہے۔ وہ شاید گھر کی چار دیواری اور بچّوں کو قید خانہ اور زنجیریں سمجھتی تھی لیکن میں نے کبھی شکایت نہ کی کیونکہ میں نے کبھی تکلیف محسوس نہیں کی تھی۔

ایک روز اُس نے مجھے کہا کہ یہاں ایک بوڑھا رہتا ہے جو میرے محکمے میں ملازم ہے۔ اُس کے بیٹے کی اسی علاقے میں دکان ہے۔ بوڑھا بیمار ہے اور وہ چاہتا ہے کہ نوکری چھوڑ دے۔ اس طرح اُسے کچھ پیسہ مل جائے گا جو وہ بیٹے کی دکان میں لگائے گا۔ میں چونکہ اسی محکمے میں تھا اس لئے بیوی نے مجھے کہا کہ میں اس آدمی کی مدد کردوں اور اُسے محکمے سے رقم جلدی دلا دوں۔ میں نے بیوی سے کہا کہ میں اس شخص کو نہیں جانتا، اُسے کہنا کہ مجھے مل لے۔ ایک روز وہ آگیا۔ میں نے اُس کا کام کرا دیا۔ اُس کی عمر تقریباً ساٹھ سال تھی۔ اُس کے دکاندار بیٹے کی عمر چالیس سال تھی۔ اُس کے سات آٹھ بچّے تھے۔

اس طرح اس دکاندار کے ساتھ میرا تعلق پیدا ہوگیا۔ میں اُس کا نام نہیں لکھوں گا۔ اُسے دکاندار ہی کہوں گا لیکن یہ شخص دکاندار کم ہی تھا، وہ پنچ تھا اور خاصی اہمیت کا حامل۔ اس اہمیت کا نشان پیپلز پارٹی کا جھنڈا تھا جو اُس کی دکان پر لہراتا رہتا تھا۔ پارٹی کی عہدیداری کی وجہ سے پولیس اور محلے میں اُس کا اثر ورسوخ چلتا تھا۔ یہاں میں یہ بات صاف کرنا چاہتا ہوں کہ سیاسی پارٹی بازی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں، نہ میں پیپلز پارٹی کے خلاف یا کسی پارٹی کے حق میں کوئی بات کہنا چاہتا ہوں۔ ملک میں جو بھی پارٹی برسرِ اقتدار آتی اُس کے کارندوں نے اسی طرح گلی محلے میں حکومت کی جس طرح پیپلز پارٹی

کے دَور میں ہوتا رہا ہے۔ ایوب کے دَور میں بی ڈی ممبر فرعون بنے رہے
اور انہوں نے قانون اور پولیس کو اپنے ہاتھ میں لئے رکھا۔ اس سے پہلے
بھی جس پارٹی کی حکومت آتی اُس کے کارندوں نے ایسی ہی غیر قانونی حرکتیں
کیں اور وہ قانون سے بالاتر رہے۔

میں جس وقت کی بات سنا رہا ہوں یہ پیپلز پارٹی کی بادشاہی کا وقت
تھا اور یہ دکاندار اُن لوگوں میں سے تھا جو اس بادشاہی کے کل پُرزے تھے۔
یہ شخص شیریں زبان تھا۔ آپ چرب زبان کہہ لیں۔ باتوں سے دل موہ لیتا تھا۔
ایک روز اُس نے مجھے کہا کہ ایک محلہ کمیٹی بنانی چاہیئے جو ساری آبادی کے
مسائل حل کرے اور حکومت کے سامنے آبادی کی نمائندگی کرے۔ مجھ میں
خلوص اور سادگی ہے اور یہی میری دو کمزوریاں ہیں۔ میں نے اس دکاندار
کی تجویز کو بہت پسند کیا۔ میں تو پہلے ہی اس کا قائل تھا کہ ہر محلے میں ایک ایک
کمیٹی بن جاتے تو ہمارے بہت سے مسائل، تنازعے اور گھریلو جھگڑے مل
بیٹھ کر ختم کئے جا سکتے ہیں۔

ہم نے پہلا اجلاس ایک اور آدمی کی بیٹھک میں کیا اور محلہ کمیٹی کی
تشکیل ہوگئی۔ تمام ممبروں کے ذمے مستقل طور پر چندے کی پابندی لگائی
گئی۔ یہ دکاندار خزانچی بن گیا اور مجھے بھی عہدیداروں میں شامل کر لیا گیا۔ اس
سلسلے میں اس دکاندار کے ساتھ میل ملاقات زیادہ ہوگئی۔ محلہ کمیٹی میں چندہ
آنے لگا جو اس شخص کے ہاتھوں خرچ ہوتا تھا۔ ایک دو واقعات سے میں سمجھ
گیا کہ یہ شخص دیانتدار نہیں اور بہت چالاک آدمی ہے لیکن اس کی زبان کا
جادو ایسا تھا کہ میں اس سے متاثر بھی تھا۔ میری بیوی کا اس کے گھر آنا جانا
زیادہ تھا۔

میں نے اپنے ایک کمرے کے مکان کو وسعت دینے کے لئے محکمے
سے مزید قرض کی درخواست کی۔ محکمے نے پندرہ ہزار روپے کا قرض برائے
تعمیر مکان منظور کر دیا۔ اس کی پہلی قسط پانچ ہزار روپیہ مجھے ملی تو میری بیوی
نے کہا کہ میں یہ رقم اُس کے نام جمع کرا دوں۔ میں نے اُسے کہا کہ یہ رقم اُس

کے نام جمع ہو یا میرے نام، اس سے کیا فرق پڑتا ہے، یہ مکان پر خرچ ہوگی۔
بیوی کہنے لگی کہ میں یہ رقم اُس کے باپ کو دے دوں اور اُسے کہوں کہ تعمیر
کا سامان وہ خریدا کرے اور تعمیر کی نگرانی بھی کرے۔ میں نے یہ تجویز اس لئے
مان لی کہ میرے پاس ان کاموں کے لئے وقت نہیں تھا اور تجربہ بھی نہیں
تھا۔ میں نے اُس کے باپ کے ساتھ بات کی تو اُس نے کہا کہ ہم دونوں
اکٹھے بازار جایا کریں گے۔

مجھے قرض کی پوری رقم مل گئی اور مکان کی تعمیر شروع ہوگئی۔ میرا سسر
سامان کی خریداری اور تعمیر کی نگرانی کرتا تھا۔ وہ جتنے پیسے مانگتا میں چیک کاٹ
دیتا تھا۔ اس دوران میری بیوی میری ماں کے پاس گئی۔ میرے ماں باپ
اپنے مکان میں رہتے تھے۔ میری بیوی نے میری ماں سے شکایت کی کہ اُسے
(میری بیوی کو) محلے کی دو تین عورتوں نے گالیاں دی ہیں۔ ماں فوراً آ گئی۔
ان عورتوں سے ملی۔ عورتوں نے میری ماں کو بتایا کہ تمہاری بہو آوارہ ہوتی جا
رہی ہے۔ ان عورتوں نے اسی دکاندار کا نام لیا جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔
انہوں نے میری ماں سے کہا کہ تمہاری بہو اسی کے گھر میں گھسی رہتی ہے اور یہ
لوگ اچھے نہیں۔

بیوی نے مجھے بتایا کہ یہ عورتیں اس لئے اُسے گالیاں دیتی ہیں کہ کبھی
نمک مانگنے آ جاتی ہیں، کبھی کچھ، کبھی کچھ، جیسے ان کے گھر میں کچھ ہے ہی نہیں۔
اب میں انہیں صاف جواب دیتی ہوں اس لئے میرے خلاف ہوگئی ہیں۔ میری
ماں نے مجھے بتایا کہ میری بیوی اس دکاندار کے گھر بیٹھی رہتی ہے۔ میں نے بیوی
سے کہا کہ وہ کسی عورت سے تعلق نہ رکھے اور دکاندار کے گھر نہ جایا کرے۔ بیوی
مان گئی لیکن دکاندار کے گھر کے متعلق اُس نے کہا کہ اُن کے گھر ایک شادی
ہونے والی ہے اور وہ اُن کے کپڑے سی رہی ہے۔ دو تین دنوں کی بات
ہے، پھر وہ وہاں نہیں جایا کرے گی۔

میں نے دکاندار کی بیوی سے کہا کہ وہ کپڑے کسی اور سے سلوا لیں،
میری بیوی کو اتنی دیر اپنے گھر میں نہ رکھا کریں۔ اُس نے جواب دیا کہ جن

عورتوں نے میری بیوی کو بدنام کیا ہے اُن کے دلوں میں ناراضگی کچھ اور ہے۔ عورتوں نے چند سو روپوں کی کمیٹی ڈال رکھی تھی جو کسی وجہ سے لوٹ گئی تھی۔ اس پر ان عورتوں کے ساتھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ لہٰذا وہ انتقاماً میری بیوی کو بدنام کرتی پھر رہی تھیں۔ بہرحال میں نے اسے عورتوں کا کوئی عام سا جھگڑا سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

مجھے اچانک دل کی تکلیف ہو گئی۔ محکمے نے مجھے ہسپتال داخل کر دیا۔ مکان کی تعمیر جاری تھی جس کی نگرانی میرا سسر کرتا رہا۔ وہ ہسپتال میں آکر مجھ سے چیک لکھوا کر لے جاتا تھا۔ میری بیماری لمبی ہو گئی۔ یہ دکاندار مجھے ہسپتال دیکھنے آیا کرتا بلکہ اُس نے ہر صبح میرے لئے ناشتہ لانے کی پیشکش کی۔ میں نے اپنے ایک بھتیجے سے کہا کہ وہ رات میرے گھر سویا کرے۔ بھتیجے نے مجھے بتایا کہ میری بیوی گھر کم ہی رہتی ہے اور رات کو دیر سے گھر آتی ہے۔ میرے بچے چھوٹے تھے۔ پتہ چلا کہ میری بیوی اُن کی طرف توجہ نہیں دیتی۔ بھتیجا دو راتیں میرے کہنے پر میرے گھر سویا تھا۔

پھر میرے بڑے بھائی نے جو قریب ہی رہتا تھا، مجھے بتایا کہ میری بیوی اس دکاندار کے ساتھ سکوٹر پر پھرتی رہتی ہے اور رات دیر تک اُسی کے ساتھ کہیں باہر رہتی ہے۔ میں صحت یاب ہو چلا تھا مگر اس خبر کا یہ اثر ہوا کہ سنتے ہی مجھے چکر آیا اور میں بستر پہ گر پڑا۔ توقع یہی تھی کہ دل کا یہ دَورہ جان لیوا ثابت ہو گا لیکن میں شاید اپنے بچوں کے لئے زندہ رہنا چاہتا تھا، یا خدا نے مجھے اسی دنیا میں کسی گناہ کی سزا دینی تھی، میں مرا نہیں اور میرے بچنے کی اُمید بھی نہ رہی۔

بیوی ہسپتال آئی تو میں نے اُس سے پوچھا کہ یہ اطلاعیں کہاں تک صحیح ہیں؟ اُس نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا ــــ "آپ ہسپتال میں علاج کرانے آتے ہیں یا ایسی بے ہودہ باتیں سوچنے کے لئے؟"

میں نے اُس کے لہجے میں دلیری اور بے خوفی دیکھی تو میں نے محسوس کر لیا کہ حبس گھٹے ہوتے ماحول میں یہ عورت جنی، پلی اور جوان ہوتی ہے اس کے

بد اثرات اس پر غالب آگئے ہیں اور اب یہ عورت چار دیواری کی دنیا کو قید سمجھ کر راہِ فرار اختیار کر رہی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ آئندہ یہ شخص میرے لئے ناشتہ نہ لایا کرے اور تم گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی۔ اُس نے جب ایک بار پھر کہا کہ آپ اپنا علاج کرائیں تو میں نے اُسے کہا کہ میری بیماری کا باعث تم ہو، ورنہ میں صحت یاب ہو گیا تھا۔ وہ غصّے میں آگئی۔ کہنے لگی کہ اُس پر جھوٹے الزام عائد کئے جا رہے ہیں۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی ــــ "میں جا رہی ہوں"

میں نے اُس کا بُرقعہ پکڑ لیا اور کہا کہ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اُس کا خیال تھا کہ میں ہسپتال سے نہیں جا سکوں گا۔ میں ہسپتال کے دفتر میں چلا گیا۔ نرس سے کہا کہ میری فائل نکالو، میں ہسپتال سے جا رہا ہوں۔ اُس نے مجھے روکا۔ میں نے کہا کہ میں مریض ہوں قیدی نہیں ہوں۔ اُس نے میری فائل نکالی تو میں نے اُس پر لکھ دیا کہ میں اپنی ذمہ داری پر ہسپتال سے جا رہا ہوں۔ دو روز بعد آجاؤں گا۔ میں سخت غصّے میں تھا جو میری تکلیف کو اور زیادہ کر رہا تھا۔ میں نے بیوی کو ساتھ لیا اور ہسپتال سے نکل آیا۔

ہم رکشے میں بیٹھے گھر کو جا رہے تھے۔ راستے میں بیوی نے مجھے کہا کہ بلاوجہ غصّے میں اپنے آپ پر زیادتی کر رہے ہیں، آپ ہسپتال واپس چلے جائیں۔ میں نے اُسے بتایا کہ اب میرا علاج ہسپتال میں نہیں گھر میں ہو گا اور میں نے تمہارے متعلق جو کچھ سُنا ہے یہ بالکل صحیح ہے۔ وہ غصّے میں آگئی۔ رکشے میں گرما گرمی ہونے لگی۔ اُس نے دیکھا کہ میں ٹلتا نظر نہیں آرہا تو اُس نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا ــــ "میں تمہارا کوئی حکم نہیں مانوں گی، مجھے طلاق دے دو۔"

"تو تم اپنا انتظام کر چکی ہو" ــــ میں نے کہا ــــ "میرا فرض ہے کہ تمہیں ایک دو باتیں بتا دوں، پھر جو فیصلہ کرنا چاہو کر لینا" ــــ میں نے اُسے اس دکاندار کے متعلق بتایا کہ اس میں کیا کشش ہے اور وہ کیسا آدمی ہے۔ میں نے کہا ــــ "وہ صرف شادی شدہ نہیں بلکہ سات آٹھ بچوں کا باپ ہے۔"

میری بیوی نے ڈھٹائی بلکہ بے حیائی سے کہا ــــ "وہ ابھی تین شادیاں اور کر سکتا ہے۔"

اس جواب کے بعد میرا کچھ کہنا بیکار تھا۔ یہ عورت پوری طرح اِس آدمی کے حال میں آچکی تھی۔ یہ آدمی میری نسبت کتنا زندہ دل اور شگفتہ گفتار تھا۔ میں اب سادگی کے علاوہ دل کے مرض کا مریض ہو چکا تھا۔ اس دکاندار کی سب سے بڑی خوبی اور قوت تو یہ تھی کہ وہ برسرِ اقتدار پارٹی کا کارندہ تھا۔ اسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس کی اپنی بیوی شکل وصورت کے لحاظ سے ایسی ویسی ہی تھی۔ گھریلو عورت تھی۔ سات آٹھ بچے جن کر اُس میں اگر کچھ کشش کبھی تھی تو وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ اس کے مقابلے میں میری بیوی جوان تھی اور شکل وصورت اور جسم میں کشش تھی۔ اس آدمی نے اس کی کمزوریاں بھانپ لی تھیں اور اس عورت کی کمزوریوں نے اسے اندھا کر دیا۔

میں جب گھر میں داخل ہُوا تو میں نے زیرِ تعمیر مکان پر نظر ڈالی۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ سسر مجھ سے جتنی رقم لے چکا ہے اس کا نصف بھی خرچ نہیں ہُوا مگر اُس وقت مجھے پیسے کا فکر نہیں گھر کی تباہی کا غم تھا۔ مجھے یاد آیا کہ مجھے جب قرض ملا تھا تو میری بیوی نے مجھے کہا تھا کہ میں یہ رقم اُس کے نام جمع کرا دوں۔ میں نہ مانا تو اُس نے کہا تھا کہ میں تعمیر کے سامان کی خریداری اور نگرانی اُس کے باپ کے سپرد کر دوں۔ میں اب سمجھا کہ اس سے اس کا مقصد کیا تھا۔ وہ اپنے باپ کے لئے آمدنی کا ناجائز ذریعہ پیدا کرنا چاہتی تھی۔ یہ غربت کا کرشمہ تھا۔

میں تو بستر سے اُٹھنے کے قابل نہیں تھا۔ اڑوس پڑوس کی عورتیں آگئیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ میری بیوی اسی دکاندار کے ساتھ سکوٹر پر پھرتی رہتی ہے۔ یہ خبر اب میرے لئے کوئی نئی نہیں تھی۔ یہ عورتیں جلتی پر تیل ڈال کر تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ ان میں اور ان کے گھروں کے مردوں میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اس آدمی کو لعنت ملامت کرتے۔ اُس سے سب ڈرتے تھے کیونکہ وہ حکمران گروہ کا آدمی تھا۔ کسی کو رحم نہ آیا کہ میں دل کا مریض ہوں۔ عورتیں میرے پاس آئیں اور مجھے بھڑکا کر چلی گئیں۔

میں نے اپنی بڑی بچی کو جس کی عمر تیرہ سال تھی، دیکھا۔ اس کا مُنہ سُوجا

ہُوا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اسے کیا ہُوا ہے۔ اُس پر اتنی دہشت طاری تھی کہ بول بھی نہیں سکتی تھی۔ بیوی نے کہا کہ اس نے اسے ایک بات کہی تھی اور یہ گھر کا کام کاج نہیں کرتی۔ میں نے بیوی سے کہا کہ تم نے اسے اتنا مارا ہے کہ اس کا چہرہ سُوج گیا ہے۔ بیوی اِدھر اُدھر ہوئی تو میری اس بچی سے چھوٹی بچی نے مجھے بتایا کہ میں جب ہسپتال میں تھا میری بیوی رات بہت دیر تک باہر رہتی تھی۔ بچوں کی اُسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ ایک رات وہ باہر سے آئی تو میری بڑی بچی نے اسے غصے سے کہا کہ وہ گھر کیوں نہیں ٹھہرتی۔ میری بیوی نے بچی کو ظالموں کی طرح پیٹا اور مُنہ پر اتنے گھونسے مارے کہ بچی کا چہرہ سُوج گیا۔
آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ میرے بچوں پر ماں کے ظلم و تشدد کا کیا اثر پڑا ہوگا۔

میری ماں کو اطلاع ملی کہ میں ہسپتال سے آگیا ہوں تو وہ آگئی۔ اُس وقت میری بیوی مجھے بتائے بغیر کہیں چلی گئی تھی۔ میری ماں آئی تو کچھ وقت بعد میری بیوی آگئی۔ ماں نے اُسے کہا کہ تمہارا خاوند بیمار ہے اور تم باہر سیر کرتی پھر رہی ہو۔ میری بیوی نے جواب دیا —— "یہ کون ہے؟ میں اسے اپنا خاوند مانتی ہی نہیں" —— اس پر ان دونوں میں گالی گلوچ ہوئی۔ ماں غصے سے اُٹھی اور اپنے گھر کو جانے لگی۔ مجھ میں اُٹھنے کی ہمت نہیں تھی، پھر بھی میں اُٹھا اور ماں سے کہا کہ میں اس گھر میں نہیں رہوں گا۔ بیوی نے مجھے نہ روکا۔ ماں نے روکا اور کہا کہ میں اس حالت میں نہ اُٹھوں۔ میں نے اُس کی ایک نہ سُنی اور اُس کے ساتھ چلا گیا۔

رات ماں کے گھر گذاری۔ صبح اس امید پر اپنے گھر آگیا کہ بیوی کا غصہ اُتر چکا ہوگا اور اس کے ساتھ صلح صفائی ہو جائے گی۔ بیوی نے مجھے ناشتہ دیا۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ میری بیوی نے جا کر دروازہ کھولا۔ میں کمرے میں تھا۔ بیوی دروازہ بند کر کے آئی۔ میں نے بچی سے پوچھا کہ کون آیا تھا۔ بچی نے بتایا کہ وہی دکاندار آیا تھا۔ وہ میری بیوی سے کچھ کہہ کر چلا گیا۔ اپنی بیوی کو میں نے دیکھا۔ جلدی جلدی برقعہ پہن کر باہر جانے لگی۔ میں نے اُس کا برقعہ پکڑ لیا اور کہا کہ میں اُسے باہر نہیں جانے دوں گا۔ اُس نے

کہا ——"میں اپنی مرضی کروں گی۔ میں آزاد ہوں"—— اور وہ چلی گئی۔

اُس کی بڑی بہن قریب ہی رہتی تھی۔ میں بڑی مشکل سے اُٹھا اور اُسے جا بتایا۔ وہ غصّے میں میرے گھر آئی۔ میری بیوی جب واپس آئی تو بڑی بہن نے اُسے بُرا بھلا کہا۔ میری بیوی اس قدر دلیر ہو چکی تھی کہ اُس نے اپنی بڑی بہن کی چُٹیا پکڑ لی اور دونوں بہنوں میں مار کٹائی ہوئی۔ میری بیوی کی خالہ کو پتہ چلا تو اُس نے آکر اسے لعن طعن کی۔ پھر میرا سُسر آیا۔ میں نے اُسے ساری واردات سنائی تو وہ مجھ پر برس پڑا کہ میں اُس کی بیٹی کو بدنام اور پریشان کر رہا ہوں۔ اُس نے غصّے سے کہا کہ اُن عورتوں کو بلاؤ جو میری بیوی کے خلاف باتیں کرتی ہیں۔

میں نے ایک عورت کو بلوا لیا۔ اُس نے میرے سُسر کو بتایا کہ اُس کی بیٹی کس حد تک جا پہنچی ہے۔ پھر ایک اور عورت آگئی۔ اُس نے بھی میرے سُسر کو یہی کہانیاں سنائیں۔ اُس پر اُوس پڑ گئی۔ میں نے کہا کہ وہ اپنی بیٹی کو بچوں سمیت اپنے گھر لے جاتے۔ میں پورا خرچ ادا کرتا رہوں گا۔ اس وقت گھر میں جو پیسے ہیں اور جو آٹا، دانہ اور چینی وغیرہ ہے وہ بھی لے جاتے۔ میں بیمار ہوں۔ مجھے سکون سے علاج کرانے دیں۔ سُسر یہ کہہ کر چلا گیا کہ کل آکر لے جاؤں گا، مگر وہ دوسرے دن اُسے لینے نہ آیا۔ مجھے معلوم ہُوا کہ میری بیوی کے ایک بھائی نے اس تجویز کی مخالفت کی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ اس طرح وہ بدنام ہو جائیں گے۔

میری ساس آئی تو میں نے اُسے کہا کہ اپنی بیٹی کو لے جاتے، میں خرچ دوں گا۔ ساس نے میرے گھر میں جتنے پیسے تھے وہ لئے، آٹا، چینی، گھی وغیرہ سمیٹا اور میرے بیوی بچوں کو اپنے گھر لے گئی۔ اس سے مجھے کچھ سکون ملا۔ میں نے مکان کو تالا لگایا اور اپنی ماں کے گھر چلا گیا مگر دوسرے ہی روز میری بیوی بچوں کو ساتھ لئے واپس آگئی۔ کہنے لگی کہ اپنے گھر رہوں گی۔ میری ماں نے اُسے رکھنے سے انکار کر دیا۔ وہ پھر چلی گئی۔ اب اُس کی ایک بہن کا خاوند اُسے میرے پاس لایا اور اُس نے کہا کہ اب یہ کوئی ویسی حرکت نہیں کرے

گی۔ میں اسے اپنے گھر لے گیا۔ اس عورت کو میں نے دل سے اُتار دیا تھا لیکن اپنے خلوص اور اخلاق کے تحت میں یہ بھی چاہتا تھا کہ اسے تباہی سے بچا لوں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ دکاندار اسے ذلیل و خوار کر کے چھوڑ دے گا۔

میرے دفتر میں یہ اطلاع پہنچ چکی تھی کہ میں ہسپتال سے چلا گیا ہوں۔ یہ تو دفتر میں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میں پہلے سے زیادہ تکلیف میں ہوں اور میرے گھر جانے کی وجہ کچھ اور ہے۔ محکمے کی نگاہ میں میں تندرست تھا۔ چنانچہ بیماری کی حالت میں میں نے دفتر جانا شروع کر دیا۔ بیوی بچے میری ماں کے گھر رہتے تھے۔ میری بیماری کی وجہ سے ماں مجھے بتاتی نہیں تھی کہ گھر میں میری بیوی کا رویّہ کیا ہے لیکن مجھے پتہ چل گیا کہ میں دفتر چلا جاتا ہوں تو میری بیوی اپنے چکر میں نکل جاتی ہے۔ میں نے ماں سے پوچھا تو اُس نے تصدیق کر دی۔

ایک صبح میں نے بیوی کو بہت ڈانٹا اور اسے باہر جانے سے منع کیا۔ میں دفتر چلا گیا۔ شام کو واپس آیا۔ گھر میں خاموشی تھی۔ بڑی بچی نے مجھے بتایا کہ میری بیوی سامان اور زیورات لے کر اپنی ماں کے پاس چلی گئی ہے۔ وہ بڑی بچی کو چھوڑ گئی تھی۔ اُس وقت تک میرا چوتھا بچہ پیدا ہو چکا تھا۔ میں ساس کے گھر گیا اور اُسے کہا کہ میری بیوی بچوں کو لے کر یہاں آگئی ہے۔ ساس پریشان ہو گئی۔ میری بیوی وہاں نہیں گئی تھی۔ اُس کی ماں کو اُس کے متعلق کچھ علم نہیں تھا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی ہے اور دکاندار کے ساتھ گئی ہے۔ میں اُس کے گھر گیا تو وہاں اُس کا باپ ملا۔ اُس سے بات کی تو اُس نے مجھے ڈانٹ دیا۔ کہنے لگا کہ اس کا اور اُس کے بیٹے کا میری بیوی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ دکاندار کی بیوی سادہ عورت تھی۔ وہ اپنے خاوند کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ خاموشی سے گھر بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ اب یہ کیس پولیس کا تھا۔ میں نے تھانے رپورٹ درج کرانے کا ارادہ کیا لیکن اس سے پہلے محلّے داروں کے ساتھ بات کرنا مناسب سمجھا۔ ہم نے جو محلہ کمیٹی بنائی تھی وہ کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔

میں نے محلّے کے معززین سے کہا مجھے بیوی کی ضرورت نہیں، مجھے بچے اور سامان واپس دلا دیں۔ انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ محلّے والے میرا ساتھ دیتے

اور میرے ساتھ تھانے چلتے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ میرے گھر کو ایک آدمی کس دلیری سے اجاڑ رہا ہے اور میری بیوی بمعہ سامان اور زیورات اُس کے قبضے میں ہے۔ اس کی بجائے اِن "معززین" نے مجھے کہا پولیس کے پاس نہ جانا، ہم شام کو فیصلہ کریں گے۔

یہ لوگ میرے بچے لے آئے۔ میرا سامان اور زیورات نہ ملے۔ دھاندلی کی انتہا دیکھئے کہ دکاندار نے پیغام بھیجا کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دو، اس کے عوض تمہیں سامان مل جائے گا۔ میں بہت پریشان ہوا۔ میں بالکل بے بس تھا۔ دس بارہ روز بعد میرے دفتر میں ایک اجنبی عورت آئی۔ کچھ دیر بعد ایک اور آدمی آگیا جس نے اپنے آپ کو اس عورت کا خاوند بتایا۔ اس عورت نے مجھے کہا کہ میری بیوی اُس کی کرایہ دار ہے اور کیا میں اپنی بیوی کو رکھنا چاہتا ہوں؟ میں نے اُس سے پوچھا کہ یہ میری بیوی سے پوچھو کہ وہ میرے پاس رہنا چاہتی ہے یا نہیں۔ اس عورت نے کہا کہ وہ میرے [illegible] نہیں آنا چاہتی بہتر ہے کہ طلاق دے دو۔ میں نے اسے کہا کہ اسے کہو کہ وہ طلاق مانگے۔ میں اُن دونوں کو اپنی ماں کے پاس لے آیا۔

بات چیت اس نتیجے پر پہنچی کہ میرا دودھ پیتا بچہ جو ابھی تک میری بیوی کے پاس تھا، اور سامان مجھے واپس مل جائے۔ اس عورت نے کہا کہ وہ میرا مطالبہ پورا کر دیں گے مگر وہ اگلے روز صرف بچہ لے آئے اور بتایا کہ سامان وہ خود پہنچا دیں گے جو آج تک مجھے نہیں ملا۔

میں نے بیوی کو طلاق لکھ دی جو یونین کونسل نے منظور کر لی۔ اس کے بعد میرے تین بچے غائب کر دیئے گئے۔ میں پولیس کے پاس جانے سے ڈرتا تھا۔ بڑی مشکل سے مجھے بچے مل گئے اور اب میرے پاس ہیں۔ بیوی کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں کہاں ہے۔

مجرم کو قانون نہیں پکڑ سکا لیکن خدا کے قانون نے انہیں بخشا نہیں۔ دکاندار کے ایک بھائی نے مجھے گالیاں اور دھمکیاں دی تھیں۔ آج وہ گھر میں اپاہجوں کی طرح پڑا ہے۔ ایک حادثے میں اُس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔

دکاندار کی شادی شدہ بہن کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے اور آج تک لاپتہ ہے۔

اِسی پاکستان میں

موت میرے پیچھے بھی تھی آگے بھی۔ مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ کون سی موت کو قبول کروں۔ پیچھے سکھ بھیڑیوں کی طرح بھونکتے غراتے آ رہے تھے۔ آگے سیلابی دریا تھا۔ دریا میں کُود جانے میں امید کی مدھم سی کرن نظر آتی تھی کہ زندہ نکل جاؤں گی مگر میں نے موت کو قبول کر لیا تھا، میں زندہ نہ رہنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اگر میں زندہ رہتی تو مجھے ہر رات مرنا اور ہر روز جینا تھا۔ میرے ساتھ جو ہم سفر تھے ان میں میرا بوڑھا منگیتر بھی تھا۔ اس وقت میری عمر اکیس سال تھی اور میرے منگیتر کی عمر چار کم ساٹھ سال تھی۔ وہی مجھے اور میرے کنبے کے دو افراد کو اپنی حفاظت میں یہاں تک لایا تھا۔ میرا ایک ہی بھائی تھا۔ کچھ پتہ نہیں تھا وہ کہاں ہے۔ خیال یہی تھا کہ شہید ہو گیا ہے۔ ہمیں دریا نے روک لیا۔ پُل دُور تھا اور وہاں خطرہ بھی تھا۔ بوڑھا کہہ رہا تھا کہ پُل سے ہی جانے کا خطرہ مول لینا پڑے گا۔ یہ دریا تو جوان آدمی بھی تیر کر پار نہیں کر سکتا۔

اُس کی بات سُن کر مجھے ایسا سکون ملا جیسے اُس نے مجھے نجات کا راستہ دکھا دیا ہو۔ مجھے وہ وقت اس طرح یاد آیا جیسے یہ کل شام کی بات ہو۔ مغرب میں آسمان پر کالے بادلوں کے بڑے بڑے ٹکڑے تھے۔ سورج ایک ٹکڑے کے پیچھے چلا گیا تھا۔ اس کی کرنیں بادل کے پیچھے سے سفید چٹی لکیروں کی طرح نظر آتی تھیں۔ بادل کا یہ ٹکڑا درمیان سے ذرا سا پھٹ گیا۔ وہاں سے سورج ستارے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بادل کا یہ سیاہ ٹکڑا ساری کائنات کی روشنی اپنے دامن میں چھپاتے ہُوتے ہے۔ مجھے اطمینان سا محسوس

ہونے لگا جیسے یہ بادل میری امید کا ستارہ ہے۔ آپ جانتے ہیں جب مصائب انتہا کو پہنچ کر انسان کو مجبور اور لاچار کر دیتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو امیدوں کے دھوکے دیا کرتا ہے۔ یہی حال میرا تھا۔

میں نے دریا کے بھیانک شور کو سُنا، دریا کے قہر کو دیکھا۔ بادل کا ٹکڑا سورج کو اپنے ساتھ اُفق کے پیچھے لے گیا۔ شام گہری ہوئی تو دریا کا شور مجھے بلانے لگا۔ میں سیلابی موجوں کی پناہ میں جانے کو تیار ہو گئی۔ بوڑھا میرے قریب آیا۔ میرے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر بولا — "ذرا آرام کر لو۔ رات کو پُل سے پار جانے کا بندوبست ہو جائے گا" — میں نے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ میں مسکرا رہی تھی۔ وہ میری مسکراہٹ کو سمجھ نہ سکا۔ میں اُس وقت بہت خوش تھی کیونکہ میں نے اس بوڑھے منگیتر سے، اس دنیا سے، سکھوں اور ہندوؤں کے خطرے سے آزاد ہونے کا راستہ دیکھ لیا تھا۔ مجھے سیلابی دریا کے بھیانک شور میں نغمے اور لوریاں سنائی دے رہی تھیں۔

اس دریا کے کنارے پر آنے تک میں نے جو سفر طے کیا تھا وہ سُنا دوں تو بہتر ہو گا۔ یہ اگست کا مہینہ ہے۔ تیس سال پہلے وہ بھی اگست کا مہینہ تھا۔ یہ مہینہ جب بھی آتا ہے میں اپنے آپ کو ایک سیلابی دریا کے کنارے کھڑا دیکھتی ہوں۔ بادل کا سیاہ ٹکڑا سارے آسمان پہ روشنی بکھیرتا نظر آنے لگتا ہے اور مجھے وہ سب کچھ یاد آجاتا ہے جو ہم میں سے کسی کو بھی نہیں بھولنا چاہیئے اور جو ہمیں اپنے بچوں کو بھی یاد کرا دینا چاہیئے۔ یہ کہانی میری نہیں یہ ہماری تاریخ ہے۔

آج میرا ایک لڑکا اتنا ہی بڑا ہے جتنا ١٩٤٦ء میں میرا ایک بھائی تھا۔ میری آپ بیتی ایسی ہے کہ میں کسی جگہ کا اور کسی فرد کا نام نہیں لکھ سکتی۔ یہ کہانی اسی بیٹے سے لکھوا رہی ہوں۔ اسی نے اکسایا ہے کہ اب یہ داستان سب کو سُنا دوں .... اس کا آغاز مشرقی پنجاب کے ایک بڑے گاؤں سے ہوا تھا۔ اب تو سُنا ہے ہندوؤں نے اسے ایک بڑا قصبہ بنا دیا ہے۔ ہم درمیانہ درجے کے زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ گاؤں کی آدھی سے زیادہ آبادی

سکھوں کی تھی۔ یہ سب زراعت پیشہ تھے۔ تقریباً ہر گھر کا ایک فرد فوج میں ملازم تھا۔ ہندوؤں کے بھی چند ایک گھر تھے۔ مسلمانوں کی آبادی تین برادریوں یعنی تین ذاتوں پر مشتمل تھی اور ہم سب اپنی اپنی برادری کے رسم و رواج اور احکام کے پابند تھے۔

اُس وقت تعلیم کو آج والی مقبولیت حاصل نہیں تھی۔ لڑکیوں کو تو تعلیم سے محروم ہی رکھا جاتا تھا۔ اگر ہمارے گاؤں میں چھٹی جماعت تک لڑکیوں کا سکول نہ ہوتا تو میں بالکل اَن پڑھ ہوتی۔ چھٹی جماعت پاس کر کے زندگی چار دیواری میں گزارنے لگی۔ میں نے ابھی نوجوانی میں قدم نہیں رکھا تھا کہ بیٹوں والیاں ہمارے ہاں آنے لگیں۔ میری بدقسمتی یہ تھی کہ مجھ میں کوئی ایسا نقص نہیں تھا جو لڑکیوں میں دیکھ کر ان کے رشتے قبول نہیں کئے جاتے۔ خدا نے شکل و صورت اچھی دی تھی۔ رنگ بھی اچھا اور دماغ بھی اچھا عطا کیا تھا۔ لڑکیوں والی شوخی تو تھی لیکن شرافت کی حدود کے اندر تھی۔ ان حدود کو پھلانگنے کی کبھی سوچی بھی نہیں تھی۔ مجھ میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ میرے ماں باپ مجھے بہت زیادہ جہیز دینے کے قابل تھے۔ میری ماں عورتوں سے بھی کہتی رہتی تھی کہ میری ایک ہی بیٹی ہے، اسے اتنا جہیز دوں گی کہ دنیا انگلیاں دانتوں میں دبا کر دیکھے گی۔

میری بات کہیں بھی پکی نہ ہوئی۔ میری ماں کو کوئی لڑکا پسند نہیں آرہا تھا۔ میرے چھوٹے بھائی نے میٹرک پاس کر لی۔ والد صاحب نے اسے آگے پڑھانے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ ماں نہیں مان رہی تھی۔ بھائی نے دو سال گاؤں سے دُور ہوسٹل میں رہ کر میٹرک پاس کی تھی۔ کالج میں داخل کرانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ کم از کم چار سال گھر سے باہر ہوسٹل میں رہے گا۔ والد صاحب نے اسے داخل کرا ہی دیا۔ میں جس طرح گھر میں اکیلی بیٹی تھی اسی طرح میرا بھائی اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے بعد میرا ایک بھائی پیدا ہوا اور تین ماہ کی عمر میں مر گیا۔ پھر بہن پیدا ہوئی اور وہ ڈیڑھ سال کی ہو کے مر گئی۔ ماں کو میرے بھائی سے بہت پیار تھا۔ والد صاحب کے دل میں بھی پیار کی کمی نہیں تھی لیکن ان کی طبیعت میں تلخی زیادہ تھی۔ ہر بات حکم کے لہجے میں کیا کرتے تھے جس سے شک ہوتا تھا کہ انہیں ہم

سے پیار نہیں۔

والد صاحب میرے بھائی کو پیسے کنٹرول کر کے دیا کرتے تھے۔ ماں والد صاحب سے چوری اسے بہت سے پیسے دے دیا کرتی تھی۔ والد صاحب کے غصّے کے باوجود بھائی نہ ان سے ڈرتا تھا نہ کسی اور سے۔ خودسر ہوتا جا رہا تھا۔ کالج کے دوسرے سال وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر آیا تو ایک روز والد صاحب نے کسی بات پر اس کی خوب پٹائی کی تھی۔ میری ماں والد صاحب سے لڑ پڑی تھی۔ جوان لڑکے کو مارنا پیٹنا اچھا نہیں لگتا۔

گاؤں کا ایک ہندو لڑکا اسی کالج میں پڑھتا اور ہوسٹل میں رہتا تھا۔ اُس نے اپنی بہن کو بتایا کہ میرا بھائی وہاں سگریٹ پیتا ہے اور سینما بہت دیکھتا ہے۔ اُس کی بہن نے مجھے بتایا۔ میں اُس کے ساتھ اُس کے گھر گئی۔ اُس کے سوا گھر میں کوئی نہ تھا اور اُس کے بھائی کے آگے ہاتھ جوڑے کہ وہ میرے والد صاحب کو نہ بتاتے ورنہ وہ میرے بھائی کی ہڈی پسلی ایک کر دیں گے۔ لڑکا مان گیا۔ اُس نے کہا کہ میرا بھائی کچھ زیادہ ہی آوارہ ہوتا جا رہا ہے۔ اُس نے مشورہ دیا کہ میرے بھائی کو جیب خرچ کم دیا جاتے۔ زیادہ پیسوں کی وجہ سے اُس نے ایسے لڑکوں کے ساتھ دوستی کر لی ہے جو پڑھتے کم اور عیاشی زیادہ کرتے ہیں۔ بھائی ایک بار گھر آیا تو میں نے اُسے ہندو لڑکے کی سنائی ہوئی باتیں بتائیں اور یہ بھی بتایا کہ میں نے اُسے روک دیا ہے کہ وہ والد صاحب تک یہ باتیں نہ پہنچنے دے۔

بھائی غصّے میں آگیا۔ کہنے لگا کہ یہ ہندو بنئے دال کھاتے اور صرف ایک دھوتی میں عمر گزار جاتے ہیں۔ ہمارے جائز خرچ کو بھی وہ عیاشی سمجھتے ہیں۔ اس نے اُس لڑکے کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ مجھے ڈر لگا کہ وہ اس ہندو کی پٹائی کر دے گا۔ اُس کا مُوڈ کچھ ایسا ہی تھا۔ میں نے اُسے ڈرایا کہ اُس نے اس لڑکے کے ساتھ لڑائی جھگڑا کیا تو وہ والد صاحب کو ساری باتیں بتا دے گا۔

وہ جب تھرڈ ایئر میں تھا تو اس ہندو لڑکے نے بتایا کہ شہر میں میرا بھائی لڑکیوں کے پیچھے پھرتا ہے اور پکا بدمعاش ہو گیا ہے۔ میں نے ماں سے کہا کہ اسے پیسے نہ دیا کرے مگر ماں نہ مانی۔ وہ اپنے بیٹے کے خلاف کوئی بات

نہیں سُنتی تھی۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں بھائی آیا تو میں نے اُس کے اٹیچی کیس کی تلاشی لی۔ اس میں سگریٹ کے چار پیکٹ پڑے تھے۔ میں نے اُسے سگریٹ پینے سے منع کیا مگر اُس نے ہنس کر ٹال دیا۔ وہ اب خوبصورت جوان بن گیا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ برادری کی کسی بھی لڑکی کا نام لے، اُسے اسی لڑکی کا رشتہ لے دیا جاتے گا لیکن اس کی باتیں بتا رہی تھیں کہ وہ کچھ زیادہ ہی آگے نکل گیا ہے۔

انہی چھٹیوں کا واقعہ ہے کہ ایک دن ہمارا ایک مزارع ہمارے گھر آیا۔ دو سکھوں نے اُسے پیٹا تھا۔ وہ کھیتوں کو پانی لگا رہا تھا۔ ان سکھوں نے پانی روک کر اپنے کھیت میں لگا لیا۔ نہری علاقے میں ایسے جھگڑے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ پانی کی باری کو دیہاتی اپنی بیٹی کی عزت سمجھتے ہیں۔ وہ ہر تنازعہ پر سمجھوتہ کر لیتے ہیں لیکن پانی کی باری پر مرنے مارنے پر اُتر آتے ہیں۔ ہمارے مزارع نے ان سکھوں کے ساتھ جھگڑا کیا۔ وہ اکیلا تھا۔ سکھوں نے اسے پیٹ ڈالا۔ میرا بھائی گھر تھا۔ اُس نے کلہاڑی اُٹھائی۔ سر اور مُنہ پر پگڑی لپیٹی جس طرح دیہاتی لڑائی کے وقت سر کے بچاؤ کے لئے لپیٹتے ہیں۔ وہ دوڑ کر باہر نکل گیا۔ والد صاحب لاٹھی لے کر نکلے۔ کھیتوں کو جاتے ہوتے دونوں اپنی برادری کو للکارتے گئے۔ میں اور میری ماں بھی ان کے پیچھے گئیں لیکن برادری کے دو تین آدمیوں نے ہمیں دھکیل کر کہا کہ گھروں کو جاؤ۔ کوئی عورت باہر نہ نکلے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ باہر خون خرابہ ہوگا۔

ہم دونوں گھر جا کر چھت پر چڑھ گئیں۔ کھیت نظر آ رہے تھے۔ ادھر سے ہماری برادری کے دس بارہ آدمی لاٹھیاں اور کلہاڑیاں اُٹھاتے جا رہے تھے، اُدھر سے اتنے ہی سکھ لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح چلے آ رہے تھے۔ میرا بھائی اور والد صاحب سب سے آگے تھے۔ میری بے تابی کا یہ عالم تھا کہ میں نے ماں سے کہا کہ میں بھی کلہاڑی لے کر جاتی ہوں۔ ماں نے مجھے بُرا بھلا کہا۔ اُس کی اپنی حالت بہت بُری تھی۔ وہ اُونچی آواز میں خُدا سے دُعائیں مانگ رہی تھی۔ مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں کے بزرگ بیچ بچاؤ کے لئے دوڑے جا رہے تھے، مگر لڑائی شروع

ہو چکی تھی۔ لاٹھیاں اور کلہاڑیاں ٹکرانے لگی تھیں۔ دوسری مسلمان برادریوں کے جوشیلے جوان بھی میدان میں نکل آئے۔ وہ للکار رہے تھے —— "اگر گاؤں کا کوئی اور سکھ ہمارے خلاف آیا تو اُس کا خون پی جائیں گے۔"

معلوم یہی ہوتا تھا کہ آج کھیت پانی سے نہیں خون سے سیراب ہوں گے۔ گاؤں کے سکھوں نے اور تینوں قوموں کے بوڑھوں نے درمیان میں آ کر لڑائی ختم کرا دی۔ دونوں طرف سے چند آدمی معمولی زخمی ہوئے۔ والد صاحب کی پیشانی پر لاٹھی کی چوٹ بڑی سخت لگی تھی۔ معاملہ رفع دفع ہو گیا مگر میرا بھائی کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ کہتا تھا اپنے باپ کی چوٹ کا انتقام لوں گا۔ مشکل یہ بنی کہ والد صاحب نے اُسے بتا دیا تھا کہ انہیں کون سے سکھ نے لاٹھی ماری ہے۔ میرا بھائی اس سکھ کو للکارتا اور گالیاں دیتا تھا۔ والد صاحب اسے گھسیٹ کر گھر لے آئے۔ میرے بھائی نے والد صاحب کو غضبناک آواز میں کہا —— "میں تمہاری طرح بے غیرت نہیں ہوں۔"

مجھے یہ توقع تھی کہ والد صاحب اُسے خوب پیٹیں گے لیکن والد صاحب نے اُسے گلے لگا لیا، پھر اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میرا بھائی ماں کے کہنے پر بیٹھ گیا۔ ماں نے اُس کا سارا جسم دیکھا۔ اُسے کہیں چوٹ نہیں آئی تھی۔ وہ بیٹھ تو گیا مگر اُس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔

شام کے وقت وہ باہر نکلا۔ والد صاحب نے اُسے کہا —— "بیٹا اب لڑائی جھگڑا نہ کرنا۔ اگر سکھوں نے ذرا سی بھی حرکت کی تو دیکھنا ان کے سر کھیتوں میں پڑے ہوں گے۔ اکیلے کسی سے چھیڑ چھاڑ نہ کرنا۔"

آدھا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ باہر شور شرابا سنائی دیا۔ ہماری برادری کا ایک آدمی گھبرایا ہوا ہمارے گھر آیا۔ اُس نے میرے بھائی کا نام لے کر بتایا کہ اُس نے ایک سکھ کو چاقو کے تین چار وار کر کے قتل کر دیا ہے۔ یہ وہی سکھ تھا جس نے میرے والد صاحب کے ماتھے پر لاٹھی ماری تھی۔ اس آدمی نے بتایا کہ پیپل کے نیچے چند ایک آدمی کھڑے تھے۔ ان میں یہ سکھ بھی تھا۔ میرا بھائی وہاں گیا۔ اُس نے سکھ کو للکار کر گالی دی اور شلوار کے نیفے سے چاقو نکال کر سکھ کی طرف

دوڑا۔ سکھ نے بڑا سا پتھر اُٹھا لیا۔ میرے بھائی نے اتنی تیزی سے حملہ کیا کہ کوئی اسے روک نہ سکا۔ سکھ پتھر اُٹھا کر ابھی سیدھا ہو رہا تھا کہ میرے بھائی نے اُس کی پیٹھ پر چاقو کے دو وار کئے۔

سکھ اس طرف گھوما تو میرے بھائی نے چاقو اُس کے پیٹ میں اُتار کر پیٹ چیر دیا۔ سکھ کی انتڑیاں باہر آ گئیں۔

اتفاق سے وہاں صرف تین سکھ تھے جن میں ایک مقتول تھا۔ باقی سب مسلمان تھے جن کی تعداد پانچ یا چھ تھی۔ ان میں سے کسی نے عقل کی یہ کارروائی کی کہ میرے بھائی کو وہاں سے اپنے ساتھ بھگا لے گیا اور برادری کے ایک بڑے گھر میں چھپا دیا۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ گاؤں میں کتنا شور اُٹھا ہو گا۔ سکھوں کا غصے میں آنا قدرتی تھا۔ گاؤں میں ایک بار پھر دونوں طرف سے لاٹھیاں اور کلہاڑیاں اور کرپانیں نکل آئیں۔ سکھ مر چکا تھا۔ سکھ غالباً اس لئے لڑائی سے مُنہ موڑ گئے کہ ان کا ایک آدمی قتل ہو چکا تھا۔ قاتل گاؤں میں موجود تھا۔ سکھ اسے آسانی سے پھانسی چڑھا سکتے تھے۔ ہمارے امام صاحب، سکھوں کا گرنتھی اور ہندوؤں کا پنڈت آ گئے۔ ان تینوں نے بھی کھلی لڑائی کو روکنے کی کامیاب کوشش کی۔

میرے بھائی کو جس گھر میں چھپایا گیا تھا وہ ہماری برادری کے سب سے بڑے زمیندار کا گھر تھا۔ اب جو علاقے پاکستان میں ہیں ان میں اُس کے مربعے بھی تھے جو اُس کے باپ اور دادا کو انگریزوں نے فوجی خدمات کے صلے میں دیئے تھے۔ گاؤں کے اردگرد بھی اُس کی خاصی اراضی تھی۔ قتل کے اس واقعہ کے وقت اُس کی عمر پچاس سے دو چار سال اُوپر تھی۔ اُس کی بیوی کو مرے ایک سال ہو گیا تھا۔ اُس نے ایک اور شادی کی لیکن طلاق ہو گئی۔ وہ اثر و رسوخ والا آدمی تھا۔ میں اس کہانی میں اسے جاگیردار کہوں گی۔ گاؤں میں ہر قوم پر اُس کا رُعب تھا اور سب اُس کی عزت کرتے تھے۔

والد صاحب باہر نکل گئے تھے۔ میں اپنی ماں کے ساتھ دروازے میں کھڑی ہو گئی۔ مرد آگے نہیں جانے دیتے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم نے والد صاحب کو گھر کی طرف آتے دیکھا۔ ان کے ساتھ گاؤں کے لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہم دونوں اندر ہو گئیں۔

والد صاحب نے دروازے کے سامنے رُک کر کہا ——— "جو کوئی اندر آنا چاہتا ہے آجائے اور گھر کی تلاشی لے لے۔ میرا بیٹا مل جائے تو اُسے پولیس کے حوالے کر دو۔"

کئی سکھوں نے کہا ——— "انہوں نے لڑکے کو بھگا دیا ہوگا .... لڑکے کو ہمارے حوالے کر دو۔"

مسلمانوں کی آوازیں سنائی دیں ——— "خبردار۔ کوئی اس دروازے کے اندر قدم نہ رکھے۔ جاؤ پولیس کو بلا لاؤ۔ تھانیدار تلاشی لے گا۔"

اتنے میں ہماری برادری کا جاگیردار آگیا۔ اُس نے دبنگ آواز میں کہا ——— "کون کہتا ہے چوہدری کے بیٹے نے قتل کیا ہے۔ لڑکا گاؤں میں نہیں ہے۔ تمہارا آدمی قتل ہُوا ہے۔ لاش تھانے لے جاؤ۔ تمہیں اتنا اختیار کس نے دیا ہے کہ قاتل کو پکڑو۔"

شور شرابا ہونے لگا۔ مقتول کے گھر کی عورتیں بین کر رہی تھیں اور گالیاں بھی بک رہی تھیں۔ سکھوں کو معلوم نہیں تھا کہ میرا بھائی جاگیردار کے گھر میں چھُپا ہُوا ہے۔ سکھوں نے فیصلہ کیا کہ لاش تھانے لے جائی جائے۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ جاگیردار اندر آگیا۔ اُس نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا اور مسکرایا۔ میں بھی مسکرائی۔ وہ تو میرے باپ کی عمر کا تھا۔ میرے والد صاحب کو الگ کمرے میں لے گیا۔ تھوڑی دیر باتیں کر کے وہ والد صاحب کو ساتھ ہی لے گیا۔ میری اور میری ماں کی جان نکلی جا رہی تھی۔ مجھے اپنا اکلوتا بھائی پھانسی کے تختے پر کھڑا نظر آرہا تھا۔ میری ماں بے ہوش ہو کر گری نہیں ورنہ کسر کوئی نہیں رہ گئی تھی۔ ایک ایک منٹ ایک ایک گھنٹے کے برابر تھا۔

والد صاحب آئے اور مجھے کہا کہ میں بھائی کی کتابیں، کپڑے اور دیگر سامان جو ہوسٹل میں اُس کے ساتھ رہتا ہے فوراً تیار کر دوں۔ میں نے اور ماں نے سامان تیار کر دیا۔ ایک مزارع نے سامان اُٹھایا اور والد صاحب اُس کے ساتھ باہر نکل گئے۔ اُنہوں نے ہمارے کسی سوال کا جواب نہ دیا۔ وہ ہمیں تسلیاں دیتے رہے لیکن خود گھبرائے ہوئے تھے۔ رات اندھیری ہو چکی تھی۔ وہ کوئی دو گھنٹے بعد

واپس آئے تھکے ہوئے تھے۔ ہمیں کہنے لگے کہ پولیس آئے گی اور میرے بھائی کے متعلق پوچھے گی۔ ہم یہ جواب دیں کہ بھائی چھٹیوں میں گھر آیا ہی نہیں۔ پہلی چھٹی کے روز آیا اور یہ کہہ کر چلا گیا تھا کہ وہ پڑھائی کی خاطر چھٹیاں ہوسٹل میں گزارے گا۔

اس کے فوراً بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو تھانیدار کھڑا تھا۔ اُس نے والد صاحب سے میرے بھائی کے متعلق پوچھا۔ والد صاحب نے وہی جواب دیا جو انہوں نے ہمیں بتایا تھا۔ یہ بھی کہا کہ اندر آکر تلاشی لے لیں۔ تھانیدار مسلمان تھا۔ اُس نے گھر کی تلاشی لی۔ کوٹھریاں بھی دیکھیں۔ ہم دونوں سے بھی پوچھا کہ لڑکا کہاں ہے۔ ہم نے وہی جواب دیا جو والد صاحب نے بتایا تھا۔ تھانیدار نے والد صاحب سے کہا ——— "چوہدری صاحب! ملزم کو غائب کرنا مشکل نہیں ہوتا لیکن عدالت میں یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ ملزم واردات کے وقت گاؤں میں نہیں تھا۔"

"جو اللہ کو منظور ہوگا" ——— والد صاحب نے کہا ——— "اُس کی مدد سے ہم ثابت کر دیں گے کہ لڑکا گاؤں میں آیا ہی نہیں۔"

"چوہدری صاحب!" ——— تھانیدار نے رازدارانہ لہجے میں کہا ——— "موقعہ کے گواہ موجود ہیں۔ آپ کے لڑکے نے اُن کے سامنے قتل کیا ہے۔ میں آپ کے خلاف کوئی اُلٹی سیدھی کارروائی نہیں کروں گا۔ میں مُسلمان ہوں۔ سکھوں کے مقابلے میں آپ کی مدد کروں گا۔ لڑکا میرے حوالے کر دیں۔"

"اگر آپ کو مذہب کا اتنا خیال ہے تو مدد کریں" ——— والد صاحب نے کہا ——— "لڑکا گاؤں میں نہیں ہے۔ قتل اُسی نے کیا ہے۔ میں ثابت کروں گا کہ وہ گاؤں میں آیا ہی نہیں تھا" ——— والد صاحب نے آہستہ سے کہا ——— "اگر آپ میری مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہوسٹل سے میرے لڑکے کو کل نہیں پرسوں گرفتار کرنے جائیں۔ ایک دن اور مہلت دے دیں تو اور زیادہ اچھا ہوگا۔ میں آپ کی خدمت کر دوں گا۔"

والد صاحب اُسے ایک کمرے میں لے گئے۔ ذرا دیر بعد تھانیدار چلا گیا۔ والد صاحب نے اُس کی نقد خدمت کر دی تھی۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ اپنے جو آدمی موقعۂ واردات پر موجود تھے ان میں سے ایک میرے بھائی کو وہاں سے

بھگا لے گیا اور جاگیردار کے گھر چھپا دیا۔ جاگیردار کو بتایا گیا کہ لڑکے نے ایک سکھ کو قتل کر دیا ہے۔ جاگیردار نے لڑکے کو چھپا لیا اور اس آدمی سے کہا کہ موقعۂ واردات پر جتنے مسلمان موجود تھے انہیں کہہ دو کہ وہ لڑکے کے متعلق لاعلمی کا بیان دیں۔ ہمارے گھر آکر جاگیردار نے میرے والد صاحب کو بتایا کہ وہ رات کی گاڑی سے لڑکے کو شہر لے جا رہا ہے۔ وہاں وہ اُسے ہوسٹل میں اُس کے کمرے میں لے جائے گا۔ اگلے روز وہ وہاں کے ملازم اور جو کوئی بھی وہاں ہوُا اُسے یہ بیان دینے پر آمادہ کر لے گا کہ میرا بھائی چھٹیوں میں گاؤں گیا ہی نہیں، ہوسٹل میں رہا ہے۔

جاگیردار میرے والد صاحب کو اپنے گھر لے گیا۔ انہوں نے وہاں میرے بھائی کو دیکھا۔ جاگیردار نے اُس کے خون آلود کپڑے تبدیل کرا کے کہیں غائب کر دیئے تھے۔ چاقو کسی کنوئیں میں پھینکوا دیا تھا۔ جاگیردار میرے بھائی کو بتا چکا تھا کہ وہ اُسے کس طرح بچانے کی کوشش کرے گا اور بھائی کیا کرے۔ جس وقت تھانیدار ہمارے گھر میں داخل ہوُا اُس وقت جاگیردار میرے بھائی کو گاؤں سے نکال لے گیا تھا۔ رات کے اندھیرے میں انہیں کوئی نہ دیکھ سکا۔ ریلوے سٹیشن تقریباً ایک میل دُور تھا۔ وہاں سے مین لائن گزرتی تھی۔ ریل گاڑیوں کی کمی نہیں تھی۔

جاگیردار اگلے روز واپس نہ آیا۔ رات کو بھی نہ آیا۔ اس سے اگلے روز آ گیا۔ اُس نے میرے والد صاحب کو اپنے گھر بلایا۔ والد صاحب بہت دیر بعد واپس آئے اور میری ماں کو الگ کمرے میں لے گئے۔ میں گئی تو انہوں نے مجھے باہر بھیج دیا۔ میری پریشانی بڑھ گئی۔ معاملہ صحیح معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن ماں نے باہر آکر میری پریشانی دُور کر دی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ جاگیردار ہوسٹل میں تمام انتظام کر آیا ہے۔ اُس نے تین چار آدمیوں کو مُنہ مانگی رشوت دے کر یہ بیان دینے پر تیار کر لیا ہے کہ میرا بھائی گاؤں گیا ہی نہیں۔ ہوسٹل میں چار پانچ اور لڑکے چھٹیاں گزار رہے تھے۔ انہیں بھی جاگیردار نے تیار کر لیا تھا۔ ماں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جاگیردار ایک انگریز پولیس آفیسر سے بھی مل آیا ہے۔

میں نے ماں سے پوچھا کہ یہ باتیں مجھ سے چوری کیوں کی گئی ہیں؟ ماں نے جواب دیا کہ تم ابھی بچّی ہو۔ بعض باتیں نازک ہوتی ہیں جو کسی کے سامنے مُنہ سے نکل جائیں تو بہت نقصان ہوتا ہے، مگر میرا دل نہیں مان رہا تھا کہ ماں سچ کہہ رہی ہے۔ وہ چونکہ خوش اور مطمئن تھی اس لئے میری پریشانی کم ہوگئی۔ اُس وقت صرف اپنے بھائی کا غم تھا۔ والد صاحب نے مجھے تسلی دے کر غم ہلکا کر دیا۔ دونوں، ماں اور والد صاحب، جاگیردار کی اتنی تعریفیں کر رہے تھے جیسے اس کے احسان کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہوں۔ وہ اس کی تعریفیں مجھ سے مخاطب ہو کر کرتے تھے۔ میں خود اس شخص کے آگے سجدہ کرنے کو تیار تھی۔ میں بہن تھی جس کا اکیلا بھائی پھانسی کے تختے پر کھڑا تھا۔ جاگیردار نے اسے بچانے کے لئے ایسی کارروائی کی تھی جو اُس کے لئے بھی خطرناک ہو سکتی تھی۔ والد صاحب نے بتایا کہ جاگیردار یہ سارا اہتمام اپنے خرچ پر کر رہا ہے۔ جہاں رشوت دینی ہوتی وہ خود ہی دیتا۔ ہم غریب تو نہیں تھے۔ والد صاحب نے اُسے کہا کہ وہ تمام اخراجات دیں گے لیکن جاگیردار نے کہا کہ یہ اُس کا فرض ہے اور وہ میرے بھائی کو اپنا بیٹا سمجھتا ہے۔

ایک روز بعد میرے بھائی کو شہر کے ہوسٹل سے گرفتار کر لیا گیا۔ موقعہ کے گواہوں کی نشاندہی پر میرے بھائی کی گرفتاری لازمی تھی۔ دونوں طرفوں سے پولیس نے بیان لئے اور چند دنوں بعد مقدمہ عدالت میں چلا گیا۔ وہاں سے مقدمہ سیشن کورٹ میں گیا۔ جاگیردار نے بہت بھاگ دوڑ کی۔ اُس نے جو گواہ تیار کئے تھے ان میں سے کسی ایک نے بھی دھوکہ نہیں دیا۔ جاگیردار نے یہاں تک انتظام کر دیا تھا کہ شہر کے ایک چھوٹے سے ہوٹل کے مالک کو یہ گواہی دینے کے لئے تیار کر لیا تھا کہ میرا بھائی چھٹیوں کے دوران اُس کے ہوٹل میں کھانا کھاتا رہا ہے۔ ایک کاپی بھی عدالت میں پیش کی گئی جس پر میرے بھائی کے روزمرّہ کھانے کا حساب لکھا تھا۔ ہوٹل والے نے بیان دیا کہ لڑکے نے ابھی یہ پیسے ادا نہیں کیے۔ قتل والے روز کے بھی پیسے لکھے تھے۔

مختصر یہ کہ صفائی کی شہادتیں اور ثبوت ایسے پیش کئے گئے کہ سیشن کورٹ نے میرے بھائی کو بری کر دیا۔ اُس وقت تک پانچ چھ مہینے گزر چکے تھے۔

گاؤں میں مسلمانوں اور سکھوں میں کھچاؤ پیدا ہونا ہی تھا۔ والد صاحب نے بلکہ جاگیر دار نے میرے بھائی کے ساتھ دو آدمی لگا دیئے جو اس کے محافظ تھے۔ وہ پھر کالج میں چلا گیا۔ ہمیں ہر وقت یہ ڈر رہتا تھا کہ مقتول کے بھائی انتقام لیں گے۔ ہمارے لئے ایک ایک دن اور ایک ایک رات بڑی ہی بھاری اور لمبی ہوتی تھی۔

ایک روز میری ماں نے یہ کہہ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکال دی کہ جاگیر دار نے میرا رشتہ مانگا ہے اور میرے والد صاحب نے ہاں کر دی ہے۔ اُس وقت اُس کی عمر پچپن چھپن سال ہو چکی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے زمین اور آسمان بہت تیزی سے گھومنے لگے میری نظر گاؤں یا برادری کے کسی اپنے ہم عمر آدمی پر نہیں تھی۔ میرے رشتے کے لئے جن لڑکوں کی باتیں آتی تھیں میں نے ان کے متعلق بھی کبھی نہیں سوچا تھا کہ کون کیسا ہے اور ان میں سے کون مجھے اچھا لگتا ہے، مگر جاگیر دار کے متعلق سُن کر میرا خون جہاں تھا وہیں جم کے رہ گیا۔

"اس نے تمہارے بھائی کو پھانسی کے تختے سے اُتارا ہے"۔۔۔ ماں نے کہا۔۔۔ "اس نے میرے اکلوتے بچے کو نئی زندگی دی ہے ۔۔۔۔ اور وہ کوئی ایسا بوڑھا تو نہیں۔ آج کل کے چار نوجوانوں کو اکیلا پچھاڑ دے"۔۔۔ میں چُپ چاپ سُن رہی تھی۔ ماں نے آگے ہو کر میرے کان میں کہا۔۔۔ "اس نے کہا ہے کہ میں آدھی جائیداد تمہاری بیٹی کے نام کر دوں گا۔"

قتل جیسے جرم کی بھیانک سزا سے میرے بھائی کے بچ آنے کی جو خوشی تھی، وہ بالکل ہی ختم ہو گئی۔ مجھے اگر کہا جاتا کہ اپنے بھائی کو بچانے کے لئے تم پھانسی چڑھ جاؤ تو میں ہنستی مسکراتی جان دے دیتی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ جاگیر دار میرے بھائی کو بچانے کی کیا قیمت مانگے گا۔ میں اپنے بھائی کے لئے ایک ہی بار جان دے سکتی تھی۔ ہر روز اور ہر رات مرنے اور مر کر جینے کے لئے میں بالکل تیار نہیں تھی۔ ماں سمجھ گئی کہ میں جاگیر دار کو قبول نہیں کروں گی۔ اُس نے مجھے سوچنے کا موقع دیا۔ اس کے بعد میری زندگی کے جو دن آئے وہ ماں کی زبان سے جاگیر دار کی تعریفیں سُننے گزرنے لگے۔ میں نے صرف ایک بار اتنا کہا کہ میرے لئے کیا یہی

آدمی رہ گیا تھا؟

مجھے بتایا گیا کہ جس روز جاگیر دار میرے بھائی کو ہسپتال سے چھڑا کر گاؤں لایا تو اُس نے میرے والد صاحب کو اپنے گھر بلایا تھا۔ اس ملاقات میں اُس نے میرے والد صاحب کو بتایا کہ لڑکے کو بچانا ناممکن نظر آتا ہے لیکن وہ اپنا پیسہ بھی استعمال کرے گا، سفارشیں بھی اور اپنا اثر و رسوخ بھی استعمال کرے گا۔ یہ بات غلط نہیں تھی۔ دن دہاڑے سکھ قتل ہُوا تھا اور موقعہ کے گواہ بھی موجود تھے۔ قتل کا باعث بھی صاف ظاہر تھا۔ ان حالات میں میرے بھائی کا سزائے موت سے بچنا تو آسان تھا، عمر قید سے بچنا واقعی ناممکن تھا۔ میرے والد صاحب رو پڑے۔ جاگیر دار نے انہیں تسلی و لاسہ دیا۔ والد صاحب کی اسی جذباتی کیفیت میں جاگیر دار نے ان کے ساتھ میرا ذکر چھیڑ دیا اور اس ذکر کو گھما پھرا کر اس خواہش پر لے آیا کہ وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔

والد صاحب جب اُس کے گھر سے آئے تھے تو میری ماں کو کمرے میں لے گئے تھے۔ انہوں نے مجھے کمرے سے نکال دیا تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ والد صاحب میری ماں سے مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ اُس وقت ماں کے دل اور دماغ پر اکلوتے بیٹے کی زندگی اور موت سوار تھی۔ لڑکی کی تو کوئی قدر و قیمت ہی نہیں ہوتی۔ لڑکی کو نقد قیمت لے کر بھی دیا جا سکتا ہے، جائیداد کے عوض بھی کسی لوفر لفنگے یا باپ کی عمر کے آدمی کے حوالے کیا جا سکتا ہے اور اسے یرغمال کے طور پر بھی رکھوایا جا سکتا ہے۔ ماں کو اپنا بیٹا عزیز تھا جو سگریٹ بھی پیتا تھا، شہر میں لڑکیوں کے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا اور پکا بدمعاش بن گیا تھا۔ ماں کو بیٹی کے جذبات کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی جو چار دیواری کے اندر شرافت سے زندگی بسر کر رہی تھی۔۔۔ ماں نے میرے والد صاحب سے کہا کہ میرے بچے کو بچا لو اور میری بیٹی لے لو۔ والد صاحب نے جاگیر دار سے وعدہ کر لیا کہ وہ اُسے میرا رشتہ دے دیں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جاگیر دار نے معجزہ کر دکھایا تھا۔ اُس نے صرف گواہ ہی تیار نہیں کئے تھے بلکہ پولیس کے ایک دو انگریز افسروں کا دباؤ تھانیدار پر

ڈلوایا تھا۔ تھانیدار کو میرے والد صاحب نے تو رشوت دی ہی تھی، جاگیردار نے انگریز افسروں کے دباؤ کے علاوہ اپنی جیب سے خاصی رقم دی تھی۔ تھانیدار نے مقتول کے کیس کو کمزور کر دیا تھا۔ جاگیردار نے سرکاری وکیل کو بھی رشوت دی تھی۔ اُس کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ اُس کی بھاگ دوڑ اور کوششوں کی قدر و قیمت الگ تھی۔ اُس نے ہوٹل کے مالک کو معلوم نہیں کتنے سو روپے دے کر گواہی دلائی تھی۔ میں نے ماں سے کہا کہ وہ والد صاحب سے کہے کہ جاگیردار نے جتنا خرچ کیا ہے اُسے ادا کر دیں۔ ہم مالی لحاظ سے یہ بوجھ برداشت کر سکتے تھے مگر والد صاحب نے بالکل دیہاتی مردوں جیسا جواب دیا کہ میں زبان دے چکا ہوں۔

میں والد صاحب کے مزاج کو جانتی تھی۔ وہ حکم چلانے والے باپ تھے۔ ماں میری کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ والد صاحب کی غلام ہونے کے علاوہ وہ خود جاگیردار کو خوش کرنا چاہتی تھی۔ ایک بھائی رہ گیا تھا۔ وہ جوان تھا اور بی اے کے آخری سال میں تھا۔ وہ خودسر بھی تھا۔ مجھے اس پر بھروسہ تھا کہ ماں باپ کا فیصلہ بدلنے کی کوشش کرے گا۔ میں نے ماں سے اتنی سی بات منوالی کہ وہ شادی میں جلدی نہ کرے۔ جاگیردار کی طرف سے تحفے آنے شروع ہو گئے۔ جاگیردار کی ایک بیٹی کی شادی ہو چکی تھی اور اُس کے دو بیٹے جوان تھے جن میں سے ایک مجھ سے ڈیڑھ دو سال بڑا اور دوسرا ڈیڑھ دو سال چھوٹا تھا۔ میرے دل میں یہ بھی آئی کہ اُس کی بیٹی اور بیٹوں سے بات کروں کہ اپنے باپ کو شادی سے روکیں لیکن جرأت نہ ہوئی۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اس کے بڑے بیٹے کو کسی کی زبانی پیغام بھیجوں کہ وہ اپنے باپ سے کہے کہ وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ شاید اس سے جاگیردار کو شرم آ جاتی لیکن اس ڈر سے چُپ رہی کہ بات باہر نکل گئی تو میری بدنامی ہوگی۔

ایک روز میرا بھائی اچانک آ گیا۔ اُن دِنوں چھٹیوں کا کوئی موقع نہیں تھا۔ یہ ۱۹۴۶ء کے آخری دِنوں کا واقعہ ہے۔ ہم سب کو معلوم تھا کہ ہندوستان کے مسلمان انگریزوں سے الگ ملک مانگ رہے ہیں جسے پاکستان کا نام دیا جا رہا تھا۔

اِن دِنوں الیکشن کا بھی ہنگامہ تھا۔ ہندوؤں کی سیاسی پارٹی کانگرس دعویٰ کرتی تھی کہ وہ مسلمانوں کی بھی نمائندہ جماعت ہے۔ ہندو اور سکھ لیڈر ہمارے گاؤں میں بھی آتے اور تقریریں کرتے تھے۔ وہ انگریزوں کے خلاف، مسلم لیگ اور قائداعظمؒ کے خلاف بولتے تھے۔ کہتے تھے کہ محمد علی جناحؒ انگریزوں کا ایجنٹ ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ پاکستان بن گیا تو اس کے بادشاہ انگریز ہوں گے جب کہ باقی ہندوستان آزاد ہوگا۔ یہ غیر مسلم لیڈر "ہندو مسلم سکھ عیسائی۔ آپس میں ہیں بھائی بھائی" کے نعرے لگاتے اور مسلمانوں کو سبز باغ دکھاتے تھے۔ میں نے کبھی پوری طرح توجہ نہیں دی تھی۔

مسلمان لیڈر بھی آتے تھے۔ اُن کی تقریریں دل پر اثر کرتی تھیں۔ وہ محمد بن قاسم سے بات شروع کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ ہندوستان مسلمانوں کا ملک ہے جو انگریزوں نے دھوکے سے مسلمانوں سے ہتھیا لیا تھا۔ اب ہم انگریز سے اپنا ملک لے کر ہندوؤں کو اس میں سے واجبی سا حصہ دیں گے۔ وہ کہتے تھے کہ ہمیں محمد بن قاسم، محمود غزنوی، حیدر علی، ٹیپو، سید احمد اور جنگِ آزادی کے تمام شہیدوں کی روحیں شرمسار کر رہی ہیں۔ ہمیں سومنات کے بُت للکار رہے ہیں۔ مسلمانو اُٹھو۔ اِن ہندوؤں پر جو ہمیں اپنا بھائی کہہ رہے ہیں یہ ثابت کر دیں کہ ہم بُت شکن ہیں بُت فروش نہیں۔ اِن ہندوؤں نے ہماری مسجدوں کو اصطبل بنایا ہے۔ قرآن کی توہین کی ہے۔ ایک سو سال سے ہندو اس ملک میں مسلمانوں کا قتلِ عام کر رہے ہیں۔ اگر ملک کی باگ ڈور ہندوؤں کے ہاتھ میں آ گئی تو یہ اس ملک سے اسلام کا نام و نشان مٹا دیں گے۔

اس سے چند ہی مہینے پہلے ہمیں دو جگہوں سے خبریں مل چکی تھیں کہ وہاں ہندوؤں نے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا اور مسلمان مستورات کی آبروریزی کی ہے۔ ایک گڑھ مکتیشر تھا دوسرا صوبہ بہار۔ بہار کے مظلوم مسلمانوں کے لئے تو ہمارے گاؤں کے مسلمانوں نے بھی دل کھول کر چندہ دیا تھا۔ ان دونوں جگہوں کے قتلِ عام کی جو اطلاعیں ہمیں ملتی تھیں وہ سُن کر خون کھولتا اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ بہار میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے گھروں میں گھس کر دودھ پیتے بچوں کو برچھیوں اور

تلواروں کی نوکوں پر اُٹھایا اور باہر پھینکا تھا مسلمان خواتین کو مسجدوں میں لے جا کر بے آبرو کیا تھا۔ مکانوں کو آگ لگا کر زندہ مسلمانوں کو اس میں پھینکا تھا۔

ہندوؤں کی اِس ناقابلِ یقین درندگی اور بربریت سے پتہ چلتا تھا کہ ان کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف کتنی زیادہ نفرت بھری ہوتی ہے۔ ہندو جہاں بھی مسلمانوں پر حملہ کرتے تھے (اور اب بھی کرتے ہیں) وہاں بوڑھوں کی بجائے نوجوانوں، بچّوں اور عورتوں کو زیادہ قتل کرتے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان کی نسل آگے نہ چلے۔ دوسرا مقصد یہ کہ مسلمان اس قدر دہشت زدہ ہو جائیں کہ اسلام ترک کر کے ہندو ہو جائیں۔

میں اُس وقت سیاست کو نہیں سمجھتی تھی لیکن مسلمان لیڈروں کی تقریریں سُن کر سینے میں ایمان کا شعلہ بھڑکتا تھا۔ ہندو لیڈروں کے الفاظ میں اور لب و لہجے میں عیاری صاف نظر آتی تھی۔ گڑھ مکتیشر اور صوبہ بہار میں مسلمانوں کے قتلِ عام، آتش زنی اور آبروریزی کے حادثے بتاتے تھے کہ ہندو ہمیں کتنا کچھ اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں حادثے صرف ۱۹۴۶ء کے ہیں، صرف ایک سال کے —— ہمارے گاؤں کا بچّہ بچّہ "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگانے لگا۔

ان حالات میں ایک روز اچانک میرا بھائی آ گیا۔ اُس کی باتیں اور لب و لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ مسلمان لیڈروں کی طرح باتیں کرتا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ پاکستان کیا ہے اور ہم کیوں پاکستان بنانا چاہتے ہیں۔ یہ تو میں سمجھ چکی تھی۔ اُس نے بتایا کہ شہروں میں کالجوں کے لڑکوں نے تعلیم سے توجہ ہٹا لی ہے اور وہ اب مسلمانوں کو پاکستان کے محاذ پر متحد اور صف آرا کرتے پھر رہے ہیں۔ کالجوں میں مسلم اور غیر مسلم لڑکوں کے تصادم بھی ہوتے ہیں۔ مسلمان لڑکوں نے قسمیں کھالی ہیں کہ پاکستان لے کے رہیں گے۔ اگر انگریز نے ملک کو ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم کیے بغیر آزادی دے دی تو ملک میں ہم زمین دوز اور دہشت ناک تحریک چلائیں گے جو دراصل اسلحہ اور بارود کی جنگ ہو گی۔ بھائی نے بتایا کہ ہندوؤں نے بھی جنگی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ ملک میں خانہ جنگی ہو گی۔ ہم نوجوان چاہتے ہی یہی ہیں کہ

خانہ جنگی ہو۔ اِس طرح ہم ہندوؤں سے اس سے زیادہ علاقے حاصل کر سکتے ہیں جو ہم نے مطالبۂ پاکستان میں شامل کیے ہیں۔

ایسی باتیں کرتے مجھے اپنا بھائی بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ بہشت کے پانی سے نہا کر آیا ہو۔ اُس کی رُوح بھی دُھلی دھلائی معلوم ہوتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ نوجوان اسی روپ میں اچھے لگتے ہیں، خوبصورت نظر آتے ہیں۔ باتوں میں قومی جذبے کا جوش اور آنکھوں میں قومی وقار کی چمک ہو تو نوجوان آسمان سے اُترے ہوئے فرشتے لگتے ہیں۔ میں روزِ محشر خدا کے حضور گواہی دوں گی کہ پاکستان نوجوانوں نے بنایا تھا۔ محاذ الیکشن کا تھا یا جلسے، جلوسوں، مظاہروں، لاٹھیوں، آنسو گیس اور گولیوں کا، نوجوانوں نے سر دھڑ کی بازی لگائی۔ کتنی ایک نے جانیں قربان کر دیں اور دشمن کو شکست دی۔

میرے بھائی نے میرا بھی خون گرما دیا۔ اُس نے بتایا کہ الیکشن ہو رہے ہیں جن میں مسلمان یہ ثابت کریں گے کہ وہ ایک اُمّت ہیں، وہ ایک الگ تھلگ قوم ہیں اور اُن کی قومیت ہندوستانی نہیں مسلمان ہے اور ہم ثابت کریں گے کہ کانگرس صرف ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہے۔

"ہماری صفوں میں غدّار بھی ہیں" —— اُس نے کہا —— "یہ وہ جاگیردار ہیں جنہیں انگریز نے جاگیریں اور مربعے دے رکھے ہیں۔ ان کے دادا پردادا نے انگریزوں کی خدمت اُس وقت کی تھی جب انگریز نئے نئے آئے تھے اور مسلمان اپنی آزادی کے لئے ان کے خلاف لڑ رہے تھے۔ ان غدّاروں نے انگریزوں کے قدم جمائے اور اپنی قوم کو دھوکہ دے کر اسے انگریزوں کا غلام بنایا۔ اس غدّاری کے صلے میں انگریزوں نے انہیں جاگیریں اور نقد انعام دیئے۔ آج ان کی اولاد انگریزوں کی خدمت گزار ہے۔ یہ سب مسلمان ہیں۔ یہ پاکستان کے اتنے ہی خلاف ہیں جتنے ہندو۔ یہ نہیں چاہتے کہ انگریز یہاں سے چلا جائے" ——

اُس نے کہا —— "ایک غدّار ہمارے گاؤں میں بھی موجود ہے۔ تمہیں شاید معلوم نہیں، یہ برادری کو درپردہ گمراہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"کون ہے؟"

"وہی جس نے مجھے سزائے موت سے بچایا ہے" — میرے بھائی نے کہا — "میں اس کا احسان ساری عمر نہیں بھولوں گا لیکن اس کا یہ گناہ بھی نہیں بخشوں گا۔ مَیں پاکستان کے نام پر اپنی جان دے دُوں گا۔ ایک غدّار کو قتل کرنا اور پھانسی چڑھ جانا شہادت کا رُتبہ رکھتا ہے"۔

"خُدا کے لئے ایسے نہ کہو" — میں نے بھائی کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہا — "تمہارے دشمن پھانسی چڑھیں"۔

"اگر قتل کرنے کی ضرورت پڑی تو میں اسے اس طرح قتل نہیں کروں گا جس طرح سکھ کو للکار کر کیا تھا" — بھائی نے کہا — "جاگیر دار جیسے آدمیوں کو کسی اور طریقے سے قتل کیا جاتا ہے۔ میں اُسے یہ کہنے آیا ہوں کہ وہ قوم کا ساتھ دے اور غدّاری سے باز آجائے۔ اُس نے مجھ پر بہت بڑا احسان کر رکھا ہے۔ میں کبھی نہیں بھُول سکتا کہ اُس نے میرے گلے سے پھانسی کا رسّہ نکالا ہے۔ یہ ایک ناممکن کام تھا جو اُس نے کیا تھا۔"

"تم شاید نہیں جانتے کہ اُس نے اس احسان کی کتنی قیمت مانگی ہے" — میں نے کہا۔

"کیا؟"

"اُس نے میرا رشتہ مانگا ہے" — میں نے جواب دیا — "ہمارے جناب والد صاحب اور محترمہ والدہ صاحبہ زبان دے چکے ہیں"۔

میرے بھائی پر اُسی طرح سکتہ طاری ہوگیا جس طرح ماں کے مُنہ سے یہ خبر سُن کر مجھ پر طاری ہُوا تھا میں نے اُسے بتایا کہ ماں مجھے اُس کی آدھی جائداد کا لالچ دے رہی ہے۔ میں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ اُس نے ہمارے والد صاحب کے آگے بڑی چالاکی سے یہ شرط رکھی تھی کہ وہ میرے عوض اُسے سزا سے بچالے گا۔ بولتے بولتے میرے آنسو جاری ہوگئے۔ میں نے بھائی سے کہا کہ مجھے خُدا کے بعد اُسی کی ذات پر بھروسہ ہے۔ بھائی بھڑک اُٹھا۔ اُس نے کہا کہ یہ شادی کسی قیمت پر نہیں ہوگی ... تھوڑی ہی دیر بعد ہمارے گھر میں ہنگامہ سا بپا ہوگیا۔

والد صاحب اور میرے بھائی میں بڑی اُونچی آواز میں ترش کلامی ہوئی۔ ماں میرے بھائی کے آگے ہاتھ جوڑ رہی تھی کہ وہ اُن کی عزّت کا خیال کرے۔

والد صاحب میرے بھائی کو بار بار کہتے تھے کہ جاگیر دار نے اُسے پھانسی کے تختے سے اُتارا ہے۔ میرے بھائی نے دو تین بار کہا کہ تم لوگ مجھے بتادیتے کہ وہ میری بہن کے رشتے کے لئے مجھ پر احسان کر رہا ہے تو میں اُس کا احسان قبول ہی نہ کرتا اور سزائے موت یا عمر قید قبول کر لیتا۔ اب میری جگہ میری بہن عمر قید بھُگتے گی۔ والد صاحب نرم ہوتے گئے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ لڑکا بہت جوش میں ہے۔ میرا بھائی تو مرنے مارنے پر تُلا ہُوا تھا۔ کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ میرا بھائی باہر نکل گیا، پھر میری شامت آگئی۔ والد صاحب اور میری ماں مجھے بُرا بھلا کہنے لگے کہ میں نے بھائی کو بھڑکا دیا ہے۔ میں رونے کے سوا کیا کرسکتی تھی۔

شام کو جاگیر دار ہمارے گھر آیا۔ اُس نے میرے والد صاحب سے میرے بھائی کی شکایت کی۔ معلوم ہُوا کہ میرے بھائی نے اُس کے گھر جا کر اُسے کہا تھا کہ ایک تو وہ میرے رشتے کا خیال دماغ سے نکال دے اور دوسرے یہ کہ وہ قوم کا ساتھ دے اور زمین دوز طریقوں سے انگریز نوازی ترک کردے۔ میرے والد صاحب اور ماں نے اُس سے میرے بھائی کی غلطی کی معافی مانگی اور کہا کہ وہ نادان نوجوان ہے۔ اتنے میں نادان نوجوان آگیا۔ میرے والد صاحب نے جاگیر دار کو خوش کرنے کے لئے میرے بھائی کو ڈانٹا۔

"ذرا غور سے سُن لو بزرگو!" — میرے بھائی نے کہا — "میں اپنی بہن کو قربان کردوں گا۔ خود بھی قربان ہوجاؤں گا لیکن پاکستان کے خلاف ایک لفظ نہیں سُنوں گا۔ اس الیکشن میں جس مسلمان کا ووٹ کانگرسی امیدوار کے بکس میں جائے گا وہ زندہ نہیں رہے گا خواہ وہ میرا باپ ہی ہو۔ اگر ہمیں پاکستان نہ ملا تو مسلمانوں کے لئے ذریعۂ نجات یہی ہوگا کہ پوری قوم خودکشی کرلے۔ یہ صرف آپ کی اور میری عزّت کا مسئلہ نہیں یہ قوم کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ ۱۸۵۷ء میں غدّاروں نے قوم کو شکست دی تھی۔ اب ہم غدّاروں کو موقع نہیں دینا چاہتے۔ اگر اس الیکشن کے بعد پاکستان نہ ملا تو ہندوستان ہندوؤں اور مسلمانوں کے

خون میں ڈوب جائے گا۔ آئینی جدوجہد کے بعد ہم گولے بارود اور قتل وغارت کی جنگ لڑیں گے۔"

اُس نے ایسی باتیں کیں کہ دونوں بوڑھے خاموش ہو گئے۔ جاگیردار چالاک آدمی تھا۔ وہ ہنس پڑا اور میرے بھائی کی تعریفیں کرنے لگا۔ میرا رشتہ لینے کی خاطر وہ میرے بھائی کو ناراض نہیں کر سکتا تھا۔

الیکشن ہُوا۔ مسلمانوں نے مسلم لیگ کے امیدواروں کو کامیاب کر کے ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک الگ تھلگ قوم ہے اور اس قوم کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں کا ایک ملک بنایا جائے جس کا نام پاکستان ہوگا۔ الیکشن کے بعد بھی پنجاب میں مسلم لیگ کی وزارت نہ بننے دی گئی۔ انگریز اور ہندو مسلمانوں کو بڑی سخت سزا دینے پر تُلے ہوئے تھے۔ پنجاب میں مسلمانوں نے احتجاجی مظاہرے شروع کر دیئے۔ اُن کا مرکز لاہور تھا۔ آج کے مشرقی پنجاب (بھارت) کے کالجوں کے طلبا بھی لاہور چلے گئے تھے۔ ان مظاہروں میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ "حکایت" میں آپ ان مظاہروں کی کہانیاں پڑھتے رہتے ہیں۔ انگریزوں کی پولیس اور فوج نے مسلمانوں پر بہت ہی زیادہ تشدد کیا تھا۔ لڑکیوں نے لاہور سیکرٹریٹ میں داخل ہو کر گورنر کے دفتر پر پاکستان کا جھنڈا چڑھا دیا تھا۔ مسلمانوں نے جان اور مال کی بے دریغ قربانیاں دے کر انگریزوں کی حکومت کو بنیادوں تک ہلا ڈالا تھا۔

گرفتاریاں اندھا دُھند ہوتی تھیں۔ میرا بھائی اس دوران گاؤں نہ آیا۔ کئی بار والد صاحب اُسے دیکھنے گئے۔ ہر بار یہ خبر لے کر آتے کہ وہ لاہور چلا گیا تھا۔ والد صاحب لاہور بھی گئے مگر بھائی نہ ملا۔ دل کو جلا دینے والی خبریں ملتی تھیں۔ کبھی اطلاع ملتی کہ وہ گرفتار ہو گیا ہے۔ ایک اطلاع ملی کہ شہید ہو گیا ہے۔ کسی نے بتایا کہ ایک جلوس پر گولی چلی تو وہ زخمی ہو کر گر پڑا تھا۔ اس کے بعد اُسے کسی نے نہیں دیکھا۔ ایسے بھی ہوتا تھا کہ جلوس پر پولیس لاٹھی چارج کرتی یا گولی چلاتی تو [illegible] نہیں ملتی تھیں۔ پولیس کہیں غائب کر دیتی تھی۔ ہم نے نذرانے مانے، قرآن ختم

کراتے، میری ماں خانقاہوں اور مزاروں پر ماتھا رگڑتی رہی مگر بھائی کا پتہ نہ چلا۔

مظاہرے ختم ہو گئے۔ مسلمانوں نے یہ میدان بھی مار لیا تھا۔ پھر ۳ جون کا تاریخی دن بھی آ گیا جب ملک کی تقسیم کا اعلان ہُوا۔ پاکستان میں آنے والے صوبوں کا اعلان کر دیا گیا۔ میرا بھائی پھر بھی نہ آیا۔ میرے والد صاحب اور میری ماں نے جاگیردار کے آگے رو رو کر بُرا حال کر دیا۔ جاگیردار اُس کے اپنے بیان کے مطابق، لاہور جاتا رہا۔ ہر بار آ کر یہ خبر سناتا کہ وہ لاہور کے جیل خانے میں بھی دیکھ آیا ہے، اُسے میرے بھائی کا کھرا کھوج نہیں ملا۔ میرے والدین کی اس جذباتی حالت سے اُس نے یہ فائدہ اُٹھایا کہ میرے ساتھ باقاعدہ منگنی کر لی۔ اُس نے میرے لئے انگوٹھی بھیجی جو میری انگلی میں ڈالی گئی۔ میں نے رات کو اُتار کر ماں کو دے دی۔ شادی میرے بھائی کی گمشدگی کی وجہ سے ملتوی رہی۔

مجھے یہ شک ہونے لگا کہ میرے بھائی کو جاگیردار نے مروا دیا ہے یا اُسے غائب کروا دیا ہے کیونکہ میرے بھائی نے اُسے صاف کہہ دیا تھا کہ تم میری بہن کے ساتھ شادی نہیں کر سکو گے۔ میرے بھائی نے اُس پر غدّاری کا الزام بھی عائد کیا تھا جو بالکل صحیح تھا۔ میں نے والد صاحب اور ماں سے اس شک کا اظہار کیا مگر وہ جاگیردار کے مرید بنے ہوئے تھے۔ ہمیں بعض لوگوں نے بتایا کہ ان ہنگاموں میں کئی مسلمان لاپتہ ہو گئے ہیں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ خبر سُن کر ماں اور بہن کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ حقیقت یہی نظر آتی تھی کہ میرا بھائی پاکستان کے نام پر قربان ہو گیا ہے لیکن میں اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی تھی۔

وہ دن آ گیا جس کے لئے معلوم نہیں کتنی بہنوں نے بھائی قربان کئے تھے۔ اُس روز آپ پاکستان میں آزادی کا جشن منا رہے تھے اور ہم کُفرستان میں ہندوؤں اور سکھوں کے تیور دیکھ دیکھ کر خوفزدہ ہوتے جا رہے تھے۔ بوڑھے سکھوں نے ہمارے بزرگوں سے کہہ دیا تھا کہ انہوں نے بھائیوں کی طرح عمر گزاری [illegible] اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ گاؤں کے مسلمان وقت سے پہلے پاکستان کو روانہ ہو

جاتیں۔ بوڑھے سکھوں نے یہ بات خلوص سے کہی تھی، دھمکی نہیں دی تھی۔ یہی بات جوان سکھوں اور ہندوؤں نے بھی مسلمانوں سے کہی لیکن اس میں دھمکی کا رنگ تھا۔ جس جگہ اور جس گھر میں انسان پیدا ہُوا، ہنس کھیل کر بڑا ہُوا اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑنے کا وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔ اگر گھر کا تمام سامان اور مکان کی ایک ایک اینٹ بھی ساتھ لے جانے کا بندوبست کر لیا جاتے پھر بھی انسان اس جگہ کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔

اپنے وطن، اپنے گاؤں اور اپنے گھر کے ساتھ ہماری جذباتی وابستگی بھی ایسی ہی تھی۔ ہم میں سے کسی نے سوچا ہی نہیں تھا کہ ہم سے پاکستان ایسی قربانی مانگ رہا ہے جو ہمارے تصوّروں میں بھی نہیں آسکتی۔ ہمارے بڑوں نے اس اُمید پر تکیہ کیا کہ دونوں ملکوں کو آزادی مل گئی ہے، چند روز بعد ہندو سکھ ٹھنڈے ہو جائیں گے مگر اُسی رات چھتوں پر سونے والوں نے دُور دُور آگ کے شعلے دیکھے۔ کئی گاؤں میں مسلمانوں کے گھر جل رہے تھے۔ ہمیں اس جاگیردار نے مروا دیا جو مطالبۂ پاکستان کے خلاف تھا۔ یہ بعد میں معلوم ہو گیا تھا کہ اُس نے یونینسٹ (انگریز نواز) پارٹی کے امیدوار کو ووٹ دیا تھا۔ مسلمانوں کے خلاف ہونے کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو ہندوؤں کا دوست سمجھتا تھا۔ اُس نے ساری برادری کو یقین دلایا کہ اُس کی بدولت ہندو سکھ کم از کم ہمارے گاؤں کے مسلمانوں پر ہاتھ نہیں اُٹھائیں گے۔

یہ اُس کی خوش فہمی تھی۔ ہندو اور سکھ مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے۔ مسلمان کانگرسی تھا یا سرکاری پارٹی کا وہ مسلمان تھا اور اُسے قتل کرنا کافروں کا مذہبی فرض تھا۔ اگر ہندو ہمیں دل سے بھائی سمجھتے تھے تو ہمیں کہتے کہ اب تم ہندوستانی ہو اور ہمارا مرنا جینا اکٹھا ہو گا۔ جونہی انہیں اپنی حکومت ملی انہوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کر دیا.... ہمارے بزرگ ابھی کچھ فیصلہ نہ کر پاتے تھے کہ ہمارا گاؤں خاک و خون کے طوفان اور سیلاب کی لپیٹ میں آگیا۔ کسی کو بچنے کا موقع نہ تھا۔ حملہ رات کو ہُوا۔ اگر سکھوں کے پاس صرف کرپانیں اور برچھیاں ہوتیں تو مسلمان لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مقابلہ کرتے مگر وہاں بندوقیں

اور پستول چل رہے تھے۔ پھر بھی مسلمانوں نے مقابلہ کیا اور شہید ہُوتے۔

سکھوں کا زیادہ تر ہلّہ ہمارے گھر پر تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں مَیں تھی، ایک خوبصورت اور جوان لڑکی، اور دوسری وجہ یہ کہ میرے بھائی نے ایک سکھ کو قتل کیا اور بری ہو گیا تھا۔ سکھوں کو انتقام کا موقع مل گیا تھا۔ گاؤں کی کیفیت یہ تھی کہ عورتوں اور بچوّں کی چیخوں سے آسمان کانپ رہا تھا۔ گولیاں چل رہی تھیں۔ سکھ مسلمانوں کو اور پاکستان کو گالیاں دے رہے تھے۔ ان کے ساتھ ہندو بھی تھے۔ وہ دروازے توڑ کر اور دیواریں پھلانگ کر مسلمانوں کے گھروں میں داخل ہوتے، جوان لڑکیوں کو سب سے پہلے پکڑتے پھر گھر کے باقی افراد کو برچھیوں، کرپانوں اور بندوقوں وغیرہ سے قتل کرتے اور گھروں کو لُوٹتے تھے۔ جن مسلمان لڑکیوں کو موقع ملا وہ کنوؤں میں کُود گئی تھیں۔

میں تفصیلات میں نہیں جانا چاہتی۔ تیس سال گزر گئے ہیں۔ آج بھی وقت یاد آتا ہے تو یہ صرف یاد نہیں ہوتی، یوں لگتا ہے جیسے میں اُسی گاؤں میں چلی گئی ہوں اور میرے اِردگرد مسلمانوں کے بچے برچھیوں اور کرپانوں سے کٹ رہے ہیں، لڑکیاں گھسیٹی جا رہی ہیں، لوگ بھاگ رہے ہیں، مارے جا رہے ہیں اور جلتے ہوتے مکانوں کے شعلے آسمان کو چاٹ رہے ہیں.... آج بھی مجھ پر اُسی طرح ہَول طاری ہو رہا ہے جس طرح تیس سال پہلے ہُوا تھا۔ میں نے کہا ہے کہ یہ آپ بیتی تو بظاہر میری ہے لیکن یہ ہماری تاریخ ہے جو ہمیں ہمیشہ یاد رکھنی چاہیئے۔ میں اُن پاکستانیوں کو جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد پیدا ہوتے تھے یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ہم نے یہ خطّہ خون کے دریاؤں جتنی قربانی دے کر حاصل کیا تھا۔ آپ کی اپنی بہنوں اور بیٹیوں جیسی لڑکیوں کی عصمتیں لُٹ گئی تھیں۔ ان میں سے وہ خوش نصیب تھیں جنہیں قریب کنواں مل گیا اور وہ اس میں کُود گئیں۔ اُنہیں بھی خوش نصیب ہی سمجھو جو ہندوؤں اور سکھوں کی درندگی کی تاب نہ لا کر فوراً مر گئی تھیں۔ ذرا اُنہیں تصوّر میں لائیں جنہیں سکھوں نے اسلام سے محروم کر کے اپنی بیویاں بنا لیا اور اُن کے بطن سے سکھ پیدا کئے۔

اُن بچوّں کو تصوّر میں لائیں جن کے پیٹ چاک کئے گئے تھے اور اُن کی

لاشوں کو گدھ اور کُتے کھا گئے تھے۔ اگر آپ اسلام کی آبرو باختہ بیٹیوں کو اور
معصوم شہیدوں کو یاد رکھیں گے تو آپ اس پاکستان کی قدر و قیمت جان
سکیں گے جسے آپ سیاست گری کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں۔ آپ یہ سمجھنے کی زحمت
ہی نہیں کر رہے کہ آپ کا بہی خواہ کون اور دشمن کون ہے۔

مَیں نے وہ وقت دیکھا ہے جسے آپ ہزار کوشش کریں تو بھی تصور
میں نہیں لا سکتے۔ میرے والد صاحب مجھے کسی ایسی جگہ چھپانے کی کوشش کر رہے
تھے جہاں بلوائی مجھے دیکھ نہ سکیں۔ ماں کو زیورات اور نقدی کا غم تھا۔ دروازہ
ٹوٹ رہا تھا۔ مجھے اپنا انجام نظر آ رہا تھا۔ والد صاحب نے ماں کے ہاتھ سے
زیورات اور نقدی کی پوٹلی چھین کر کہا کہ یہ میں سکھوں کو دے کر کہوں گا کہ یہ
سب دولت تمہاری ہے، ہم تینوں کو یہاں سے نکل جانے دو۔ ہمارا مکان پختہ
اینٹوں کا تھا۔ قلعے کی طرح مضبوط اور محفوظ تھا، اسی لئے بلوائی فوراً اندر نہ
آ سکے۔

چھت پر کئی ایک آدمیوں کے دوڑنے کی آوازیں سُنائی دیں۔ اُن کے
بھاری قدم سیڑھیاں اُترنے لگے۔ والد نے مجھے پلنگ کے نیچے چھُپا دیا۔ کمرے
میں لالٹین جل رہی تھی۔ میں نے پلنگ کے نیچے سے دیکھا۔ والد صاحب نے
دیوار کے ساتھ کیل سے لٹکتی ہوئی کلہاڑی اُتار لی اور بلند آواز سے کہا ——
"یا اللہ تیرا ہی آسرا ہے" —— میں پلنگ کے نیچے سرک کر دیوار کی طرف ہوئی
تو میرا ہاتھ لاٹھی پر پڑا۔ یہ لاٹھی نہیں برچھی تھی جو پلنگ کے نیچے پڑی رہتی تھی۔
دیہات میں کلہاڑی، برچھی اور لاٹھی ہر گھر میں ہوتی تھی۔ والد صاحب نے کمرے
کا دروازہ بند نہ کیا۔

میں نے لالٹین کی روشنی میں پلنگ کے نیچے سے دیکھا۔ دروازے
میں پہلے دو سکھ داخل ہوئے، ان کے پیچھے دو اور آئے۔ والد صاحب نے "آ جاؤ
کافرو" کہہ کر کلہاڑی تانی۔ میں برچھی لے کر پلنگ کے نیچے سے نکل آئی اور سکھوں
کو مردوں کی طرح للکارا۔ صرف دو سیکنڈ کی بات تھی جو دو گھنٹوں جتنی لمبی معلوم
ہوئی۔ مجھے وہ چار سکھ آج بھی اچھی طرح یاد ہیں۔ اُن کے سر اور چہرے موٹے

ململ کی پگڑیوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ اُن کی آنکھیں، ناک اور مونچھیں نظر آتی تھیں۔
وہ یقیناً شراب پئے ہوئے تھے۔ اُن کی آنکھیں گہری لال تھیں۔ میں مارنے اور
مرنے کے لئے پوری طرح تیار تھی۔ والد صاحب نے کلہاڑی تان لی تھی مگر چاروں
سکھ برچھیاں اُٹھائے نیم دائرے میں کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے باہر کو
مُنہ کر کے کہا —— "اوئے کدھر ہو۔ آ کر انہیں سمجھاؤ۔"

صرف دو یا تین سیکنڈ گزرے ہوں گے۔ دو آدمی باہر سے دوڑتے
آئے وہ سکھ نہیں تھے۔ ایک نے کہا —— "ہم ڈیوڑھی کا دروازہ دیکھنے چلے گئے
تھے۔ باہر سے سکھ دروازہ توڑ رہے ہیں" —— انہوں نے بھی سروں پر اور
ٹھوڑی کے نیچے پگڑیاں لپیٹ رکھی تھیں۔ ایک نے کہا —— "ہم بڑے چوہدری
صاحب (جاگیردار) کے گھر سے آئے ہیں۔ فوراً یہاں سے نکلو۔ صرف زیور اور
روپیہ پیسہ ساتھ لے آؤ۔"

والد صاحب نے انہیں پہچان لیا۔ وہ جاگیردار کے ملازم تھے۔ ہم تینوں
اُن کے ساتھ باہر نکلے۔ والد صاحب پھر کمرے میں چلے گئے۔ انہوں نے لالٹین
اُٹھائی۔ اس کا تیل والا حصہ کھولا۔ تیل پلنگ پر چھڑک دیا اور لالٹین کا شیشہ
اُوپر اُٹھا کر لالٹین پلنگ پر پھینک دی۔ میں نے شعلہ اُٹھتا دیکھا جو بہت تیزی
سے پلنگ پر پھیلنے لگا۔ جاگیردار کے ایک ملازم نے انہیں بلایا۔ والد صاحب
نے جلتے ہوئے پلنگ پر ایک چارپائی پہلو کے بل رکھ دی اور بولے ——
"اب یہاں سے راکھ لُوٹیں گے۔"

وہ ہمیں سیڑھیوں پر لے گئے۔ پیچھے ایک سیڑھی لگی ہوئی تھی جو انہوں نے
ہی کہیں سے لا کر لگائی تھی۔ باہر جلتے ہوئے مکانوں کی روشنی تھی۔ ہمارا گھر گاؤں
کے کنارے پر تھا۔ ہم باہر باہر سے جا رہے تھے۔ مجھے تین چار سال کی عمر کے دو
بچے بھاگتے دکھائی دیتے۔ میں نے لاشیں بھی دیکھیں اور میں نے بڑے ہولناک
منظر دیکھے۔ چاروں سکھوں اور جاگیردار کے ملازموں نے ہمارے گرد گھیرا ڈال
رکھا تھا۔ میرے اُوپر چادر تھی۔ چہرہ اسی میں چھُپا ہوا تھا۔ وہ ہمیں گاؤں سے
باہر سے لے جا رہے تھے۔ جاگیردار کا گھر دوسری تھا۔ مجھے شک اور خطرے کا

احساس ہُوا۔ والد صاحب نے اسی خطرے کو محسوس کرتے ہوئے مسلمان ملازموں سے پوچھا کہ وہ ہمیں کدھر لے جا رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ جاگیردار اپنے ایک بیٹے کے ساتھ گاؤں سے دُور ہمارے انتظار میں کھڑا ہے۔ اُس کے خاندان کے دوسرے افراد اور دوسرا بیٹا پہلے نکل گئے تھے۔

میرا ڈر دُور نہیں ہُوا تھا۔ ہم دھوکے کا شکار ہو رہے تھے مگر ہم نہتے تھے۔ گاؤں سے زیادہ دُور نہیں گئے تھے کہ سامنے سے آواز آئی — "سب آ گئے ہیں؟" — ایک ملازم نے جواب دیا — "ہاں چوہدری جی!"

یہ دھوکہ نہیں تھا۔ جاگیردار اپنے ایک بیٹے کے ساتھ کھڑا تھا۔ ایک سکھ نے کہا — "اور حکم چوہدری جی؟ اپنے آدمی گِن لو .... اور سُنو چوہدری جی! ریلوے سٹیشن کی طرف نہ جانا۔ زندہ نہیں پہنچ سکو گے" — وہ چلے گئے۔ دونوں نوکر ہمارے ساتھ رہے۔

جاگیر نے ہمیں گھر سے زندہ لانے کا ان سکھوں کو پانچ پانچ سو روپیہ ادا کیا تھا۔ پاکستان تک پہنچنے کا آسان طریقہ تو یہ تھا کہ ریلوے سٹیشن پر چلے جاتے اور کسی گاڑی پر بیٹھ جاتے مگر اُدھر بہت خطرہ تھا۔ زیادہ تر پناہ گزینوں کا رُخ ریلوے سٹیشن کی طرف دیکھا اور سکھ وہیں یا راستے میں ان پر حملے کرتے تھے۔ ہم جاگیردار کی راہنمائی میں کسی اور سمت کو چل پڑے۔ میں نے اپنے گاؤں کی طرف دیکھا۔ چار پانچ مکان جل رہے تھے۔ میں یہ دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ان میں میرے گھر کے شعلے کون سے ہیں۔ والد صاحب اپنے ہاتھوں آگ لگا آتے تھے۔ میں اندازہ نہ کر سکی۔

اس ہیبت ناک سفر میں میرے بھائی کو ہمارے ساتھ ہونا چاہیے تھا مگر وہ نہیں تھا۔ اُسے دیکھے ہوئے چھ مہینے گزر گئے تھے۔ اب جب کہ میں اپنے گھر اور اپنے گاؤں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کے جا رہی تھی، میں نے اس حقیقت کو قبول کر لیا کہ میں اپنے بھائی کی جان کا نذرانہ دے چکی ہوں۔ اگر بھائی زندہ ہوتا تو ضرور آتا۔ وہ گھر سے ناراض ہو کر تو نہیں گیا تھا۔ گاؤں سے نکلنا، گاؤں کا جلنا اور نامعلوم منزل کی طرف ایسا سفر جس کی طوالت کا کچھ علم نہ تھا، خطروں کا اندازہ۔

کیا جا سکتا تھا۔ ایسا حادثہ تھا یا خدا اتنا کڑا امتحان لے رہا تھا کہ آنسو اندر ہی کہیں خشک ہو گئے۔ دل کسی شکنجے میں جکڑا ہُوا تھا اور حلق میں گولہ سا اٹک گیا تھا۔ ذہن میں کبھی تو ہنگامہ بپا ہو جاتا اور کبھی ذہن اس طرح خالی ہو جاتا جیسے کوئی ڈراؤنا کھنڈر ہو۔

ہم ساری رات چلتے رہے۔ دُور دُور شعلے بھی نظر آتے تھے اور بلوائیوں اور مظلوم مسلمانوں کا شور و غل بھی سنائی دیتا تھا۔ ہم ویرانوں میں جا رہے تھے۔ صبح ہوتی تو ہم سڑک اور ریلوے لائن سے بہت دُور سے جا رہے تھے۔ ایک جگہ قیام کیا۔ میں زمین پر بیٹھی اور لڑھک گئی۔ خواب بھی ڈراؤنے دیکھے۔ موسلادھار بارش نے جگا دیا۔ جاگیردار نے کہا کہ چل پڑیں۔ بارش میں حملے کا یا گھات کا خطرہ کم ہو گیا تھا۔ ہم بارش میں ہی چل پڑے۔ بھوک کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ پیاس پریشان کر رہی تھی۔ میں نے مُنہ آسمان کی طرف کر کے کھول دیا اور بارش کے قطرے حلق میں اُتارنے لگی۔ ایسے ہی میرا مُنہ اُوپر تھا کہ پاؤں کیچڑ سے پھسل گیا۔ ساتھ ایک ڈھلان تھی۔ مَیں گری اور ڈھلان سے لڑھکتی نیچے جا پڑی۔ جاگیردار بہت تیزی سے آیا اور اُس نے مجھے اُٹھا لیا۔ میں اُس کے بازوؤں سے فوراً نکل جانا چاہتی تھی لیکن اُس نے مجھے بازوؤں کے گھیرے میں لئے رکھا۔ میرے ہمسفر اُوپر کھڑے دیکھ رہے تھے۔ وہ مجھے اُٹھا کر اُوپر لے جانا چاہتا تھا۔ شاید یہ ظاہر کرنا چاہتا ہو کہ وہ بوڑھا نہیں ہے۔ میں اُس کے بازوؤں سے نکل آئی۔

میری آپ بیتی لمبی ہوتی جا رہی ہے، اس لئے میں اُن مناظر کو حذف کر دیتی ہوں جو میں نے راستے میں دیکھے تھے۔ اتنا سا ذکر کر دیتی ہوں کہ راستے میں مسلمانوں کی لاشیں دیکھیں۔ ان میں عورتوں اور جوان لڑکیوں کی لاشیں بھی تھیں۔ یہ سب نیم برہنہ تھیں۔ ان سے پتہ چلتا تھا کہ موت کی منزل کے مسافر ہم سے پہلے اِدھر سے گزرے ہیں۔ یہ سب پاکستان کے گمنام شہید تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اُن کا علاقہ پاکستان میں نہیں آئے گا مگر انہوں نے الیکشن میں پاکستان کے نام پر مسلم لیگ کے امیدواروں کو ووٹ دے کر ثابت کیا تھا کہ مسلمان ایک قوم ہیں اور یہ قوم ہندوؤں کی غلامی میں نہیں رہ سکتی۔

سورج غروب ہونے میں ابھی بہت دیر باقی تھی جب ہم سیلابی دریا کے کنارے جا پہنچے اور وہاں رُک گئے۔ جاگیردار نے اپنے دونوں نوکروں سے کہا کہ وہ چھپ چھپ کر پُل تک جائیں جو وہاں سے تقریباً ایک میل دُور تھا، اور دیکھیں کہ وہاں سے خیریت سے گزرا جا سکتا ہے یا نہیں۔ وہ دونوں چلے گئے۔ میرا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ ماں کی حالت اور زیادہ خراب تھی۔ والد صاحب حوصلے میں تھے۔ بارش سفر میں پیچھے کہیں تھم گئی۔ اِدھر مینہ نہیں برسا تھا۔ ساون کا مہینہ تھا۔ بارش کا کچھ پتہ نہیں تھا کب برسنے لگے۔ میں ایک درخت کے نیچے جا کر لیٹ گئی۔ جاگیردار میرے پاس آ بیٹھا۔

میں دل کی گہرائیوں سے اُس کی ممنون تھی۔ اُس نے پہلے میرے بھائی کو سزائے موت اور عمر قید سے بچایا اور اب مجھے اور میرے والدین کو یقینی موت کے مُنہ سے نکالا تھا مگر وہ اس کا عوضانہ مانگ رہا تھا۔ اُس کی نیت صاف نہیں تھی۔ وہ مسلمان تو تھا پاکستانی نہیں تھا۔ اُس نے پاکستان کے خلاف ووٹ دیا اور برادری کو بھی گمراہ کرنے کی درپردہ کوششیں کی تھیں۔ وہ پاکستان میں پناہ لینے صرف اس لئے جا رہا تھا کہ ہندوؤں اور سکھوں نے اُسے قبول نہیں کیا تھا۔ انہوں نے اُسے بخشنا نہیں تھا۔ اگر اُس کے پاس اتنا زیادہ پیسہ نہ ہوتا تو بچ کر نکل نہیں سکتا تھا۔ اُس نے مجھے اور میرے ماں باپ کو بھی مُنہ مانگے پیسے دے کر موت سے بچایا تھا مگر ہمیں بچانے سے اُس کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں اُس کے ساتھ زندہ پاکستان جا سکوں۔ میں اُس کی منگیتر تھی۔ یہ اُس کی ذہنیت کا ایسا پہلو تھا کہ میں اس شخص کو نفرت کی حد تک ناپسند کرتی تھی۔

"اگر یہ لوگ ساتھ نہ ہوتے تو میں تمہیں کندھوں پر اُٹھا کر پاکستان تک لے چلتا" — اُس نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے کہا — "تم جو ایک قدم زمین پر رکھتی ہو وہ میرے دل پر پتھر کی طرح گرتا ہے" — میں نے اُس کے احسان کی خاطر مسکرانے کی کوشش کی۔ اُس نے کہا — "ہم کل پاکستان میں ہوں گے۔ وہاں سب کچھ موجود ہے۔ میں نے اپنا بہت سارا روپیہ اور سارے زیورات پہلے ہی پاکستان پہنچا دیئے ہیں۔ میرے مربعے بھی پاکستان میں ہیں۔ یہ سب

تمہاری دولت ہے۔ تم اس سفر کو اور اپنے گاؤں کو بھول جاؤ گی"۔

وہ بارعب چہرے اور اُونچے قد کا آدمی تھا۔ اس عمر میں وہ اس قابل لگتا تھا کہ اُس کا احترام کیا جاتے مگر اپنے آپ کو وہ جس روپ میں میرے سامنے پیش کر رہا تھا، وہ بہروپ تھا۔ وہ رومانی قسم کا نوجوان بننے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ وہ پچپن چھپن سال کی عمر جتنا بوڑھا نہیں لگتا تھا۔ اُس کا پیٹ بڑھا ہوا نہیں تھا۔ اُس کے چہرے پر جھُریوں کا کوئی جال نہیں تھا۔ اُس کی آنکھوں میں کچھ سفیدی سی آگئی تھی اور بالوں کی سفیدی بھی شروع ہو گئی تھی مگر وہ بیس اکیس سال کا جوان نہیں تھا اور اُس کے دل میں پاکستان کی محبت نہیں تھی۔ اُس نے میرے ساتھ جو باتیں کیں وہ بے کار تھیں اور مجھے ان سے گھن آ رہی تھی۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر میرے چہرے مُہرے اور سراپا میں کشش نہ ہوتی تو کیا یہ اتنا نیک تھا کہ مجھے ایک مسلمان لڑکی سمجھ کر سکھوں سے بچا لاتا؟

نوکر واپس آگئے۔ یہ خبر لائے کہ پُل سے گزرنا خطرے سے خالی نہیں۔ پُل کے اِدھر اُدھر سکھ کھڑے ہیں اور پُل پر ہندوستانی فوج کے افسر کھڑے ہیں۔ وہ پناہ گزینوں کی تلاشی لیتے ہیں۔ روپیہ پیسہ اور زیورات رکھ لیتے ہیں۔ جس کُنبے کے ساتھ جوان لڑکی ہو اُس پورے کُنبے کو روک لیتے ہیں۔ وہاں پناہ گزینوں کا ہجوم ہے۔ کوئی اکیلا دکیلا اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے تو سکھ اُسے کھڈوں میں لے جا کر قتل کر دیتے ہیں۔

دریا تیر کر پار کرنا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ پاٹ چوڑا تھا اور موجیں چٹانوں کی طرح اُوپر اُٹھتی تھیں اور اُن کے شور سے دل دہلتا تھا۔ وہاں اگر کشتی ہوتی تو درجن بھر ملاح مل کر بھی کشتی پار نہ لے جا سکتے۔ دوسرا پُل دُور تھا۔ جاگیردار نے کہا کہ آدھی رات کو اُس پُل سے گزرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم ایک اور جگہ جا بیٹھے جو نشیب تھا۔ سکھوں کا خطرہ ہر لمحہ موجود تھا۔ ہمارے آگے بھی موت تھی پیچھے بھی موت۔ پاکستان ایک ایسا تصور اور ایسا خواب تھا جو تاریکی میں امید کی بڑی ہی دلفریب کرن کی طرح نظر آتا تھا مگر یہ خیال آتا تھا کہ جاگیردار مجھے اپنی بیوی بنانے کے لئے ساتھ لے جا رہا ہے تو پاکستان جہنم کی طرح نظر آنے لگتا تھا۔

ماں میرے پاس آبیٹھی تو اس نے بھی جاگیر دار کی تعریفیں شروع کر دیں۔ مجھے بتانے لگی کہ وہ کتنے ہزار روپیہ پہلے ہی پاکستان پہنچا چکا ہے اور اس کی کتنی جاگیر پاکستان میں ہے۔

میرے دل میں آئی کہ ماں کو اُٹھا کر دریا میں پھینک دوں۔ یہیں سے میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ اپنے آپ کو دریا میں پھینک دوں؟ میں نے دریا کا قہر دیکھا تو میرے دل میں اس کا جو ڈر تھا وہ نکل گیا۔ مجھے دریا کا شور اپنی طرف بلانے لگا۔ اگر میرا بھائی میرے ساتھ ہوتا تو مجھے کسی کا ڈر نہ ہوتا۔ وہ ضرورت محسوس کرتا تو جاگیر دار کو دریا میں پھینک دیتا۔ اب تو اپنا باپ اور اپنی ماں بھی دشمن تھی۔ بھائی ایسا یاد آیا کہ زندہ رہنے کی اگر ذرا سی تمنا رہ گئی تھی تو وہ دل سے نکل گئی ..... اس ذہنی حالت میں مَیں نے آسمان کی طرف دیکھا، مغرب کی طرف مجھے بادلوں کے سیاہ ٹکڑے نظر آتے۔ ان میں سے ایک نے سورج کو اپنے پیچھے چھپا رکھا تھا۔ اس کے عقب سے سورج کی کرنیں آسمان پر پھیل رہی تھیں۔ یہ بادل اور یہ کرنیں مجھے امید کے ستارے کی طرح نظر آئیں۔ مجھے وہ وقت یاد ہے۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتی ہوں کہ اس بادل کے ٹکڑے کو دیکھ کر مجھے یقین کی حد تک محسوس ہوا جیسے خداوند تعالیٰ مجھے پیغام دے رہا ہے کہ تمہاری نجات اسی دریا میں ہے۔

بادل کا یہ ٹکڑا سورج کو اپنے پیچھے چھپائے اُفق کی طرف اُترتا گیا۔ میں ٹہلتے ٹہلتے دریا کے قریب ہو گئی۔ جاگیر دار اور دوسرے لوگ الگ بیٹھے ہوتے تھے۔ پہلے مجھے ماں کی آواز سنائی دی۔ وہ مجھے آگے جانے سے روک رہی تھی۔ میں نے گھوم کر دیکھا اور رُک گئی۔ بادلوں کی وجہ سے شام جلدی تاریک ہو گئی۔ میں اپنے ہمسفروں کے سامنے اِدھر اُدھر ٹہلتی رہی۔ جب اندھیرا انہیں میری نظروں سے اوجھل کرنے لگا تو میں آگے نکل گئی۔ اب وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں دوڑ پڑی اور دریا میں چھلانگ لگا دی۔

مجھے معلوم نہیں کہ دریا میں کود کر خودکشی کرنے والے مرنے سے پہلے کیا کرتے ہیں۔ وہ تیرنے کی کوشش کرتے ہیں یا ڈوبنے کی یا دریا خود ہی ان

کا مقصد پورا کر دیتا ہے۔ میں نے جو کچھ کیا وہ آپ کو بتا دیتی ہوں۔ میرے گاؤں سے کچھ دُور ایک چھوٹی نہر گزرتی تھی۔ گرمیوں کی چاندنی راتوں میں ہم بہت سی لڑکیاں اس میں تیرا کرتی تھیں۔ اس طرح میں نے تیرنا سیکھ لیا تھا۔ دریا میں بھی میں نے تیرنے کی کوشش کی حالانکہ میں مرنے کے لئے دریا میں کودی تھی۔ البتہ میں دریا کے وسط کی طرف جا رہی تھی جہاں موجیں اُوپر جا کر گرتی تھیں۔ میں شاید مرنے سے ڈر گئی تھی مگر مرنے کا ارادہ متزلزل بھی نہیں ہوا تھا۔ پانی کا بہاؤ بہت تیز اور تند تھا۔ مجھے موجوں نے لپیٹ میں لے لیا۔ میں اوپر چلی گئی جیسے کسی نے مجھے اُوپر کو اُچھال دیا ہو۔ وہاں سے میں نیچے کو گئی اور پھر اُوپر کو پھینک دی گئی۔

میں نے ڈوبنے کی کوشش کی لیکن میں ڈوب نہیں رہی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں اپنے آپ حرکت کرنے لگتے تھے۔ بہت دیر تک موجیں اٹھاتی اور گراتی رہیں۔ مجھے آج تک معلوم نہیں کہ جاگیر دار کو، میرے ماں باپ یا دونوں نوکروں میں سے کسی کو پتہ چلا تھا یا نہیں کہ میں دریا میں کود گئی ہوں اور انہوں نے کیا کیا تھا ..... میں بہتی گئی اور موجوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ شاید دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا ہو گیا تھا۔ میری ہڈیاں دُکھنے لگی تھیں۔ میری ذہنی حالت ایسی ہو گئی کہ میں نے اپنے بھائی کو پکارنا شروع کر دیا۔ معلوم نہیں میں اُسے مرتے وقت یاد کر رہی تھی یا اس کی رُوح کو مدد کے لئے پکار رہی تھی۔ میں چلا چلا کر اُسے پکارتی تھی۔

کسی نے میری بغل کے نیچے اپنا بازو ڈال کر مجھے اُوپر کو اٹھایا اور دریا کے شور میں مردانہ آواز سنائی دی ——"میری پیٹھ پر آجاؤ"—— میں جسمانی لحاظ سے اور ذہنی لحاظ سے بھی ختم ہو گئی تھی۔ اس بازو اور اس آواز نے میرا رہا سہا دم بھی نکال دیا مگر میں سوچنے کے قابل رہی ہی نہیں تھی۔ کچھ اُس نے کوشش کی کچھ میں نے اور میں اُس کی پیٹھ پر سوار ہو گئی۔ اس نے کہا ——"میرے بازو اور ٹانگیں آزاد رہنے دینا"—— میری حالت ایسی ہو گئی جیسے میں ہوش میں نہ رہی۔

"یہاں پانی تھوڑا ہے" — اُس کی آواز نے مجھے بیدار کیا — "اُتر جاؤ"
اور میں اُس کی پیٹھ پر سے اُتر گئی۔

ہم پانی میں چلتے باہر نکل گئے۔ دلدل میں سے گزرے اور آگے خشک زمین آگئی۔ مجھے ٹانگوں نے چلنے نہ دیا اور میں گر پڑی۔ معلوم نہیں یہ نیند تھی یا بے ہوشی۔ اُس نے مجھے جھنجھوڑا۔ میری آنکھیں چُندھیا گئیں۔ صبح کی روشنی تیز تھی۔ میں گھبرا کر اُٹھی۔ اپنے کپڑے پہچانے نہیں جاتے تھے۔ اُسے دیکھا۔ وہ جوان آدمی تھا۔ مجھ سے آٹھ دس سال بڑا ہوگا۔ تندرست اور توانا تھا۔ مجھ سے پوچھا — "پناہ گزین ہو؟ مسلمان ہونا؟" — میں نے جواب دیا کہ مسلمان نہ ہوتی تو میں دریا میں نہ ہوتی۔ اُس نے کہا — "دریا میں تمہاری آواز سُن کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ تم کون ہو۔ حیران ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ میں بھی پناہ گزین ہوں۔ آج رات اس دریا نے معلوم نہیں کتنے سَو یا کتنے ہزار مسلمانوں کو پناہ میں لے لیا ہوگا۔ پُلوں سے گزرنے والوں میں سے شاید ہی کوئی اس طرف آتے ہوں۔"

اُس نے بتایا کہ ہم خطرے سے باہر آگئے ہیں۔ پاکستان ابھی کچھ دُور ہی تھا۔ کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ بھوک کا احساس تو نہیں تھا مگر خوراک نہ ملنے سے جسم میں جان نہیں رہی تھی۔ اُس نے کہا آؤ چلیں ورنہ جسم اکڑ جائیں گے۔ ہم قدم گھسیٹنے لگے۔ اُس نے پوچھا کہ میں کون سے گاؤں سے آئی ہوں۔ میں نے صرف گاؤں نہیں بتایا ساری کہانی سُنا ڈالی۔ یہی کہانی جو آپ کو سُناتی ہے۔ پوری کہانی سنانے سے یہ فائدہ ہُوا کہ اڑھائی تین میل فاصلہ طے ہو گیا۔ اُس نے اپنے متعلق بتایا کہ وہ پاکستان میں ایک ہندو کے ساتھ کام کرتا تھا۔ مشرقی پنجاب کے ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اتفاق سے اُس کے اپنے والدین اور بہن بھائی اُس کے ساتھ پاکستان میں تھے اور سُسرال والے مشرقی پنجاب میں۔ اُس کی بیوی اور بچی جس کی عمر تین چار ماہ تھی گاؤں میں تھی۔ شادی کو ابھی تین سال ہُوتے تھے۔ وہ انہیں لینے آیا تھا مگر وہاں اُسے جلی ہُوئی لاشیں ملیں۔ وہ اُلٹے پاؤں بھاگا۔ مگر تمام راستے سکھوں نے [illegible] کر رکھے تھے۔ وہ [illegible] بھی۔ دریا کے پُل پہ آیا تو یہاں بھی موت تھی۔ وہ جوان آدمی تھا۔ رات کو اُس

نے تیر کر دریا پار کرنے کا ارادہ کیا اور دریا میں اُتر گیا۔ دریا میں اُسے میں مل گئی۔
یہ روح کی قوّت تھی جس نے ہمیں پاکستان پہنچا دیا ورنہ قدم اٹھانا محال تھا۔
میں نے سرحد پر پاکستان کا جھنڈا دیکھا تو میرے آنسو جو میں سمجھتی تھی کہ خشک ہو گئے ہیں جانے کہاں سے پھُوٹ آئے۔ میری ہچکی بندھ گئی اور میں زمین پر بیٹھ گئی۔ اپنے اُوپر قابو نہ رہا۔ چاند تارے والے اس جھنڈے میں مجھے اپنا بھائی دکھائی دے رہا تھا۔ سبز رنگ میں سفید چاند مجھے اپنے بھائی کی مسکراہٹ معلوم ہوتا تھا۔ مجھے اپنے والد صاحب اور ماں بالکل یاد نہیں آئے۔ وہاں رونے والی میں اکیلی نہیں تھی۔ وہاں سب رو رہے تھے۔ عورتیں بین کر رہی تھیں۔ بچے بلبلا رہے تھے۔ وہاں لاشیں تھیں، زخمی تھے، دہشت کے مارے ہُوئے لوگ تھے۔ وہاں ایسے بھی تھے جو پاک سرزمین پر قدم رکھتے ہی سجدہ ریز ہو جاتے تھے اور ایسے بھی تھے جو گرتے تھے پھر اُٹھتے نہیں تھے۔ مجھے روتے ہوئے کسی نے بھی نہیں دیکھا ہوگا۔

اُس نے مجھے اٹھایا اور میرا حوصلہ بڑھانے کے لئے بہت کچھ کہا، پھر مجھ سے پوچھا کہ میں ریفیوجی کیمپ میں جانا چاہوں گی یا اُس کے ساتھ چلوں گی۔ میں اُسے بتا چکی تھی کہ میں نے اپنے رشتہ داروں اور اپنے بوڑھے منگیتر سے بھاگنے کے لئے خودکُشی کی کوشش کی تھی۔ میں اب اُن کے ہاتھ نہیں آنا چاہتی تھی ..... وہ مجھے اُسی روز لاہور سے لے گیا۔ اُس نے اپنے گھر جا کر اپنے سُسرال، بیوی اور بچّی کے متعلق بتایا کہ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں تو گھر میں کہرام بپا ہو گیا۔ اس کے بعد اُس نے اپنے ماں باپ سے میرا تعارف کرایا — اور انہوں نے مجھے رسمی طور پر یا وقتی جذبات کے تحت نہیں بلکہ دِلی طور پر اپنے گھر کا فرد بنا لیا۔ یہ کُنبہ کرائے کے مکان میں رہتا تھا جس کا مالک ہندو تھا۔ وہ ہندوستان چلا گیا تھا۔ جس ہندو کے ساتھ یہ آدمی کام کرتا تھا اُس نے کاروبار اسی کو سونپ دیا اور ہندوستان چلا گیا۔

چھ سات ماہ بعد اُس کی ایک بہن نے مجھ سے پوچھا کہ میں اس کے بھائی کے ساتھ شادی کرنا پسند کروں گی؟ پسند نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ میں

نے رضامندی کا اظہار کیا لیکن اس آدمی نے مجھے کہا کہ میں صرف اس لئے اسے قبول نہ کروں کہ اس نے مجھے دریا سے نکالا، اپنی حفاظت میں پاکستان لایا اور اسے پناہ دی ہے۔ اُس نے کہا کہ میں اگر سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر شادی کرنا چاہتی ہوں تو اس کا بندوبست وہ اور اُس کے والدین کر دیں گے۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ میں اُسے دل کی گہرائیوں سے قبول کر رہی ہوں۔

پوری سادگی اور خاموشی سے ہماری شادی ہو گئی۔

وہ جاگیردار سے ڈرتا تھا۔ میں نے اُسے بتایا تھا کہ وہ اثر و رسوخ والا آدمی ہے۔ میں نے یہ کہہ کر اس کا ڈر دُور کیا کہ میں اُس کی کچھ نہیں لگتی، بالغ ہوں، اور مجھے باہر تو نہیں گھومنا پھرنا تھا۔ میں پردے میں رہتی اور باہر بُرقعے میں نکلتی تھی۔ یہ خیال بھی تھا کہ جاگیردار اور میرے والدین کہیں دیہاتی علاقے میں ہوں گے۔ یہ تو یقین سے کہا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ پاکستان میں آ گئے ہیں۔ ممکن تھا کہ وہیں مارے گئے ہوں۔ بہرحال مجھے ان میں سے کسی کا غم نہیں تھا، صرف بھائی یاد آتا تھا۔

عورت جب اپنے گھر میں آباد ہو جاتی ہے تو اُس کے ذہن سے میکہ اُترنے لگتا ہے۔ خاوند اچھا مل جائے تو عورت اپنے ماضی کو اُس کی محبت میں دفن کر دیتی ہے۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ میری ساس اور سُسر نے ماں اور باپ کا خلا پُر کر دیا اور خاوند ایسا ملا جسے میں خدائے ذوالجلال کا انعام کہا کرتی ہوں۔ ہمیں آبادکاری میں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔ ہندو کے مکان میں رہتے تھے، وہی اپنا ہو گیا۔ چلتا کاروبار مل گیا — اور دن گزرنے لگے۔ پہلا بچہ (جو آج میری کہانی لکھ رہا ہے) پیدا ہُوا تو میری جذباتی دُنیا ہی بدل گئی۔ ننھے سے کھلونے نے میرے بھائی کی یاد کی تلخی کم کر دی۔ تین سال بعد اس کا چھوٹا بھائی پیدا ہُوا۔

پھر بیس سال گزر گئے۔

میری عمر چالیس سال سے اُوپر ہو گئی تھی۔ میرا خاوند پچاس سال کے قریب پہنچ گیا تھا۔ میرا پہلا بچہ میرے بھائی کی طرح جوان ہو گیا تھا۔ اس عرصے میں مجھ تک اپنے ماں باپ کی کوئی خبر نہ پہنچی۔ دو سال پہلے میں نے بُرقعہ اُتار دیا تھا۔ ایک روز آج سے دس سال پہلے میں اپنے خاوند کے ساتھ فٹ پاتھ پر ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اس شہر میں ٹریفک کا رش نہیں ہوتا تھا۔ ایک کار ہمارے قریب سے گزری اور آگے جا کر رُک گئی۔ وہاں سے پیچھے آئی۔ کار والا باہر نکلا اور مجھے غور سے دیکھتا حیران سا ہو کے میری طرف آہستہ آہستہ آنے لگا۔ میں نے اُسے دیکھا۔ وہ کوئی معزز آدمی تھا۔ بال سفید ہو رہے تھے۔ چہرہ بہت اچھا تھا۔ مجھے پہلے تو چکر سا آیا پھر میرے مُنہ سے اپنے بھائی کا نام اس طرح نکلا جیسے میں نے چیخ ماری ہو۔ میں اُس سے لپٹ گئی۔ وہ میرا بھائی تھا۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے پر سوالوں کا مینہ برسا دیا۔ اُسے اپنے خاوند سے ملایا اور اپنے گھر لے گئی۔ میری خوشی کا اندازہ وہی بہن کر سکتی ہے جس کا بھائی قبر سے اُٹھ کر اُسے مل گیا ہو۔ میں نے اُسے اُس کے غائب ہونے سے لے کر اُس ملاقات تک کی کہانی سُنائی۔ اُس نے اپنے متعلق بتایا کہ اُسے ایک جلوس میں سے گرفتار کیا گیا تھا لیکن اُس کا جُرم سنگین تھا۔ اُس نے ایک ہندو تھانیدار کو بُری طرح زخمی کر دیا تھا۔ اُسے پانچ سال سزائے قید دی گئی۔ وہ لاہور جیل میں رہا پھر اُسے پنجاب کی دو اور جیلوں میں بھیجا گیا۔ پاکستان بن گیا تو سیاسی قیدی رہا ہونے لگے مگر اُسے رہا نہ کیا گیا۔ اُس نے گورنر کے نام درخواست بھیجی جس میں اُس نے لکھا کہ وہ مسلم لیگ کا کتنا جوشیلا ورکر تھا اور اُس نے ایک تھانیدار کو اُس وقت پیٹا تھا جب پولیس ایک جلوس پر شدید لاٹھی چارج کر رہی تھی۔

اُسے درخواست کا کوئی جواب نہ ملا۔ وہ سوچتا رہا کہ قائداعظمؒ کے نام درخواست بھیجے مگر قائداعظمؒ فوت ہو گئے۔ میرے بھائی نے اُس وقت کے وزیرِ اعظم لیاقت علی خان کے نام درخواست بھیجی کہ اُسے رہا کیا جائے مگر شنوائی نہ ہوئی۔ میرا بھائی خود سَر جوان تھا۔ اُس نے پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ کے نام درخواست لکھ کر جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو دی تو اُس نے درخواست پھاڑ کر میرے بھائی کی بے عزّتی کر دی۔ کہنے لگا کہ درخواستیں دینا تمہاری عادت ہو گئی ہے، تم

سیاسی نہیں اخلاقی مجرم ہو۔ سزا پوری کرنی پڑے گی۔ میرے بھائی نے سپرنٹنڈنٹ کی بے عزتی کر دی۔ سپرنٹنڈنٹ نے اُسے جیل کے قوانین کے تحت کوڑوں کی سزا دی، پھر قیدِ تنہائی میں ڈال دیا۔ قیدیوں کو سزاؤں میں جو معافی ملتی ہے وہ بھی کاٹ دی گئی۔

بھائی جب تین ماہ بعد قیدِ تنہائی سے نکل کر دوسرے قیدیوں میں شامل ہُوا تو وہ، وہ نوجوان نہیں تھا جس نے پاکستان بنانے کے لئے تعلیم ترک کر دی اور جو ہمارے گاؤں کے جاگیردار کو اس لئے قتل کرنے پر تیار ہو گیا تھا کہ وہ غدّار تھا۔ میرا بھائی اب غنڈہ بن چکا تھا۔ اُس کی خودسری رنگ بدل چکی تھی۔ سپرنٹنڈنٹ نے اُسے خوب پریشان کئے رکھا۔ میرا بھائی پورے پانچ سال پورے کر کے باہر نکلا۔

"پھر کہاں رہے؟" — میں نے پوچھا۔

"اسی پاکستان میں جو اپنے ہاتھوں بنایا تھا" — اُس نے مسکرا کر کہا — "اس سے آگے کچھ نہ پوچھنا میری بہن! کبھی کبھی آیا کروں گا۔ تم مجھے کہیں ڈھونڈ نہیں سکو گی۔ مجھے بھول جانے کی کوشش کرو۔ دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لو کہ میرا بھائی شہید ہو گیا تھا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ تمہارا وہ بھائی شہید ہو گیا ہے جس نے گاؤں جا کر ہمیں بتایا تھا کہ انگریز نے ہمیں پاکستان نہ دیا اور ہندوستان کو اکٹھا رکھ کر آزاد کیا تو ہم اس ہندوستان کو اپنے اور ہندو کے خون سے ڈبو دیں گے۔ پاکستان کا وہ مجاہد جیل خانے میں شہید ہو گیا تھا.... میں آتا رہوں گا۔ میری یاد آئے تو اپنے بڑے بیٹے کو گلے لگا لیا کرو۔"

اُس نے مجھے تین ہزار روپیہ دیا۔ میرے بچّوں کے ساتھ کھیلتا رہا اور چلا گیا۔ چھ سات ماہ بعد پھر آیا۔ مجھے باہر کے بہت سے کپڑے اور میرے دو بیٹوں کو بڑی قیمتی گھڑیاں دیں۔ پانچ ہزار روپیہ نقد دیا۔ وہ جانے لگا تو میں اُس سے لپٹ گئی۔ میں بہت روئی۔ میرے بچّوں نے اُسے روکا۔ پوچھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ اس نے جواب دیا — "اسی پاکستان میں" — اور وہ اپنا اَتا پتہ بتائے بغیر چلا گیا۔

پھر وہ پورے ایک سال بعد آیا۔ قیمتی تحفے اور بہت کچھ لایا۔ اس نے مجھے پانچ ہزار روپیہ دیا۔ میں نے نوٹوں کا بنڈل غصّے سے اس کے قدموں میں پھینک کر کہا — "مجھے تمہاری ضرورت ہے پیسوں کی نہیں۔ مجھے بتاؤ کہاں رہتے ہو، کیا کرتے ہو، شادی کی ہے یا نہیں۔"

اُس نے نوٹ اُٹھا کر میرے آگے رکھے۔ مجھے اُٹھا کر میرے گلے لگا اور کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ نو سال گزر گئے ہیں، وہ نہیں آیا اور میں اُسے ڈھونڈ رہی ہوں، اسی پاکستان میں، اسی پاکستان میں!

قصور کس کا!

چند دن ہوئے میرے شہر میں ایک شادی ہوئی ہے۔ مجھے اپنی ایک بیٹی اور ایک بیٹے کی شادی کی اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی جتنی اس شادی پر ہوئی ہے حالانکہ دولہا اور دلہن کے ساتھ میرا دُور پار کا بھی رشتہ نہیں۔ اس شادی کے پس منظر میں نصف صدی جتنی لمبی کہانی ہے جو میں اپنے اصلی نام سے نہیں لکھ رہا اور نہ میں چاہتا ہوں کہ میرا پتہ شائع کیا جائے تاکہ جن لوگوں کی یہ کہانی ہے انہیں شک نہ ہو کہ یہ اُن کی کہانی ہے اور نہ پڑھنے والے ہی ان لوگوں کو جان سکیں۔ میں کسی کو رُسوا نہیں کرنا چاہتا۔ میں صرف نیکی اور بدی کے تصادم کی روئیداد سُنا رہا ہوں اور بتانا چاہتا ہوں کہ بدی کہاں سے پیدا ہوتی ہے اور ماں باپ کے گناہوں کی سزا اولاد کو کس طرح بھگتنی پڑتی ہے۔

یہ کہانی ہندوستان کے ایک بڑے شہر سے شروع ہوتی ہے جس کا میں نام نہیں لکھنا چاہتا۔ ہمارے محلّے میں زیادہ تر گھرانے مسلمانوں کے متوسط طبقے کے تھے۔ محلّے کے آخر میں ہندو سکھ رہتے تھے۔ میرے پڑوس میں ایک مسلمان گھرانہ تھا۔ باپ کلرک تھا۔ اس کے تین بچے تھے۔ سب سے بڑی بیٹی تھی جس کی عمر سولہ سترہ برس تھی۔ وہ خوبصورت لڑکی تھی اور پردہ نشین۔ اس سے چھوٹے دو بھائی تھے۔ ایک کی عمر بارہ تیرہ سال ہوگی اور دوسرا اُس سے دو تین سال چھوٹا تھا۔ تنخواہ کوئی ایسی زیادہ نہیں تھی لیکن دال روٹی اچھی طرح چل رہی تھی۔ لڑکی برقعے میں سکول جاتی تھی مگر والدین نے آٹھویں یا نویں جماعت سے سکول سے اُٹھا لیا۔ کہتے تھے کہ پڑھا کر کیا کریں گے، اسے کسی دوسرے گھر چولہا چوکا ہی

کرنا ہے۔ جو پڑھ لیا وہی بہت ہے۔ اُس دَور میں یہ فیصلہ اچھا تھا۔ لڑکی گھر بیٹھ گئی اور گھریلو کاموں میں ماں نے اُسے اچھی تربیت دے لی۔ گھر میں نماز روزے کی پابندی بھی خوب تھی۔ باپ کی ظاہری شکل وصورت عام قسم کے کلرکوں کی طرح ہی تھی لیکن آدمی موقع شناس تھا۔ ہندو اور سکھ افسر مسلمان عملے کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں رہتے تھے اور ہم مسلمان کلرک اندر ہی اندر کُڑھتے رہتے تھے۔ کسی مسلمان کلرک نے کبھی کسی ہندو یا سکھ ہیڈ کلرک یا سپرنٹنڈنٹ کی خوشامد نہیں کی تھی مگر یہ کلرک بعض اوقات بھُول ہی جاتا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ غیر مُسلم افسروں کی خوشامد کے علاوہ اُن کے گھروں کے کام کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔ اس طرح وہ واحد مسلمان تھا جسے دفتر میں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ نماز روزے کا بھی پابند تھا اور محلّے میں مسکینوں کی طرح رہتا تھا۔

وقت ایک ہی ڈگر پر چلا جا رہا تھا۔ بازار کے بھاؤ ایک جگہ ٹھہرے رہتے تھے اور دو تین محکموں کے سوا رشوت کا نام کم ہی سننے میں آتا تھا۔ اچانک زمانہ بدل گیا جس کی وجہ یہ ہوئی کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ ہر چیز مہنگی ہونے لگی اور تنخواہوں میں کوئی اضافہ نہ ہُوا۔ اتنا ضرور ہُوا کہ ملک میں بے روزگاری کم ہو گئی۔ ایک ہی سال کے اندر متوسط طبقہ غریب ہو گیا اور مہنگائی اور زیادہ بڑھ گئی لیکن جنگ کی وجہ سے آمدنی کی نئی راہیں نکل آئیں جن پر صرف وہ لوگ چلتے تھے جو ایمان اور دھرم کو خیرباد کہہ دیتے تھے۔ ایسا ہی ایک راستہ ہمارے پڑوسی کو نظر آ گیا۔ اُسے ہندو ہیڈ کلرک نے محکمے کے ایسے شعبے میں لگا دیا جہاں سے ٹھیکیداروں کو ٹھیکے ملتے تھے اور ان کے بل پاس ہوتے تھے۔ ہمارا پڑوسی بالائی آمدنی سے ہیڈ کلرک کو بھی حصّہ دیتا تھا۔

یہ سلسلہ سات آٹھ ماہ چلا اور ہمارے پڑوسی کے گھر میں دولت آئی تو اُس کے اثرات صاف نظر آنے لگے۔ ایک روز معلوم ہُوا کہ پڑوسی نے نوکری سے استعفٰی دے دیا ہے۔ ہم نے پوچھا تو کہنے لگا ٹھیکیداری کروں گا۔ یہ فوجوں کو سامان سپلائی کرنے کی ٹھیکیداری تھی جو اُسے ہندو ہیڈ کلرک اور سپرنٹنڈنٹ کی سکیم کے تحت دی گئی تھی۔ ان ہندوؤں نے ہر ایک ٹھیکہ اسی کو دینا شروع کر دیا اور وہ بھی ہاتھ رنگنے لگے۔ ملک میں رشوت اور چور بازاری بھی خوب چل نکلی تھی۔ ایک اور سال گزرا تو ہمارا

پڑوسی مکمل طور پر صاحب بن گیا۔ شلوار اور پاجامے کی جگہ پتلون نے لے لی اور قیمتی سُوٹ پہن کر امیروں میں اٹھنے بیٹھنے لگا۔ اُس کا مکان خاصا کشادہ تھا لیکن پرانی طرز کا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس مکان نے کوٹھی کی صورت اختیار کر لی اور اس کوٹھی میں کاروں اور کوٹھیوں والے آنے لگے۔ مذہب کی حدیں ختم ہو گئیں۔ شرم وحجاب، دولت اور پارٹیوں کی نذر ہو گیا۔ پہلے برقعے اُترے پھر دوپٹے بھی سَروں سے اُتر گئے۔

ہمارے پڑوسی کی بیوی شکل وصورت اور قدبُت کی اچھی تھی اور اُس کی بیٹی تو بہت ہی خوبصورت تھی۔ (اسے میں ناہید کہوں گا۔ اصلی نام کچھ اور تھا) میں نے جب پہلے روز اُسے ننگے سر، کوٹھی کے برآمدے میں دو غیر مردوں کے ساتھ قہقہے لگاتے دیکھا تو میں لرز گیا۔ یہ تو نماز روزے کی پابند پردہ نشین لڑکی تھی۔ پھر ایک روز میں نے اُس کی ماں کو دیکھا تو مجھے ہنسی بھی آئی اور دُکھ بھی بہت ہُوا۔ اُس نے چہرے پر سرخی پاؤڈر کا لیپ کر رکھا تھا۔ بال اپنی بیٹی کی طرح بے حیائی سے بکھیرے ہوئے تھے اور وہ اپنے خاوند، تین باہر کے آدمیوں اور اپنی بیٹی کے ساتھ کوٹھی کے باہر بیٹھی تھی۔ میں سامنے سے گزرا اور اس منظر کو بڑے غور سے دیکھا۔ یہ ماں بناوٹی طریقے سے باتیں کر رہی تھی اور بار بار کنکھیوں سے اپنی بیٹی کو اس طرح دیکھتی تھی جیسے یقین کرنا چاہتی ہو کہ اُس کی بیٹی اُس کے مقابلے میں زیادہ جوان تو نظر نہیں آتی۔ محلّے کی عورتیں جن میں میری بیوی بھی شامل تھی، ان کی کوٹھی میں جاتی رہتی تھیں اور بتاتی تھیں کہ وہاں دولت کیا گُل کھِلا رہی ہے اور یہ لوگ کس طرح کارٹون بن گئے ہیں۔

مجھے ذاتی طور پر دولت اور دولت مندوں کے خلاف کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض یہ ہے کہ دولت کا مصرف یہ نہیں کہ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور بالاتر سمجھ کر ایسی بے ہودہ حرکتیں کرنے لگو جو عام انسان نہیں کیا کرتے لیکن ان لوگوں نے غربت دیکھی تھی اور اب دولت جو آئی تو وہ لوگوں پر ظاہر کرنے لگے کہ ہم نہ غریب ہیں نہ کبھی تھے اور ہم سب سے ارفع واعلیٰ ہیں۔ چنانچہ یہ لوگ "ایڈوانس" ہو گئے۔ دوسروں پر ثابت کرنے کے لیے کہ وہ "ایڈوانس لوگ" ہیں، انہوں نے ماں بیٹی کو بھی ننگا کر دیا۔

پھر اس کوٹھی میں جہاں دوسروں کی کاریں آیا کرتی تھیں، اُن کی اپنی کار بھی آ گئی

اور لڑکی نے ایک کار والے کو ساتھ لے جا کر ڈرائیونگ سیکھنی شروع کر دی۔ یہ کار بعض اوقات آدھی رات کے وقت گھر آیا کرتی تھی اور لڑکی کے آوارہ قہقہے دُور دُور تک سُنائی دیتے تھے۔ پھر ہم نے بیٹی کی ماں کو بھی بیٹی کی طرح میک اپ کر کے دوسروں کے ساتھ کاروں میں جاتے دیکھا۔ میں کہانی لمبی ہو جانے کے ڈر سے وہ واقعات نہیں سُنا رہا جن سے ثابت کر سکوں کہ ماں اور بیٹی نے کیا کیا ڈرامے کھیلے۔ مختصر یہ کہ محلّے کی عورتوں کے مشاہدے کے مطابق ماں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے گھنٹوں بیٹھی اس کوشش میں مصروف رہتی تھی کہ اپنی بیٹی سے زیادہ جوان اور دلکش نظر آئے۔ باپ تو اس کوشش میں لگا رہتا تھا کہ نت نئے افسروں کو پھانستا رہے اور ٹھیکے ملتے رہیں۔

اُس کے دو بیٹے تھے۔ ہم نے دونوں بیٹوں کو کار میں فاحشہ عورتوں کے ساتھ دیکھا اور انہیں شراب میں دُھت بھی دیکھا۔ ایک بار انہوں نے محلّے کے ایک لڑکے کو پیٹ ڈالا تو محلّے کے لڑکوں نے جمع ہو کر دونوں بھائیوں کی خوب پٹائی کی۔ پولیس آ گئی لیکن بیچ بچاؤ ہو گیا۔ اُس روز میں نے محلّے کے تین بزرگوں کو ساتھ لیا اور اپنے پڑوسی کے ہاں گئے۔ ہم نے اُسے یاد دلایا کہ وہ کیا تھا اور کیا بن گیا ہے۔ بزرگوں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ ایک چھوڑ دس کوٹھیاں کھڑی کر لو ہمیں خوشی ہو گی کہ ہمارا ایک مسلمان بھائی ہندوؤں کے مقابلے میں اتنا امیر ہو گیا ہے، لیکن گھر کی عزّت اور آبرو کو ہندوؤں سے بچائے رکھو اور دولت کو سنبھال کر رکھو۔

وہ ہماری پند و نصیحت سُنتا رہا آخر ایسے لہجے میں بولا جیسے یہ دو آدمی بزرگ نہیں تھے بلکہ وہ ہم سب کا بزرگ تھا۔ کہنے لگا "تم دقیانوسی لوگ ہو۔ مذہب کی زنجیروں میں اپنے آپ کو جکڑ کر تم لوگ نہ خود ترقی کرتے ہو نہ کسی کو ترقی کرنے دیتے ہو۔ ہندو اپنی لڑکیوں کو پردے میں نہیں بٹھاتے اس لیے وہ ترقی کر گئے ہیں مگر تم مسلمان عورتوں کو قید کر کے رکھتے ہو اس لیے پسماندہ ہو۔"

ہم نے اُسے بتایا کہ اُس کے دونوں بیٹے جو ابھی تک لڑکے ہی ہیں، شراب پیتے ہیں اور فاحشہ عورتوں کو کار میں لیے پھرتے ہیں اور اُس کی بیٹی بھی بے حیائی سے دوسروں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ کون شریف آدمی تمہاری اس بیٹی کا رشتہ قبول کرے گا؟ — اُس نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا — "تمہیں کس

نے بتا دیا ہے کہ میں اپنی بیٹی کا رشتہ تم جیسے پسماندہ لوگوں کو دوں گا؟ مجھے آخر اپنا سٹینڈرڈ دیکھنا ہے۔ سوسائٹی میں اپنے جیسا کوئی گھرانہ دیکھنا ہے..."

اور ہم وہاں سے اُٹھ آئے۔ سب سے افسوسناک بات یہ تھی کہ اُس کا اُٹھنا بیٹھنا ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ تھا۔ وہی اُس کے گھر میں عیش و عشرت کر رہے تھے اور اُس کی ٹھیکیداری ان ہی لوگوں کے ساتھ چل رہی تھی۔ ہندو کو ہم نے ہندوستان میں بہت قریب رہ کر دیکھا ہے۔ اسے ہزار کھلاؤ پلاؤ اور اس کے ساتھ نیکیاں کرو مگر ہندو کو جب موقع ملتا ہے وہ مسلمان کو نقصان پہنچانے میں لُطف محسوس کرتا ہے۔

جنگ ختم ہو گئی اور ہمارا پڑوسی تین کوٹھیاں بنا کر کرائے پر چڑھا چکا تھا۔ ہمیں تو اب وہ پہچانتا ہی نہیں تھا۔ جنگ ختم ہوتے ہی ملک میں سیاسی ہنگامے شروع ہو گئے۔ ہندو الگ اور مسلمان الگ ہو گئے۔ نعرے بھی الگ اور جھنڈے بھی الگ ہو گئے، مگر ہمارا پڑوسی ہندوؤں کا ہی ہم نوالہ اور ہم پیالہ رہا۔ دفتروں میں ہندوؤں نے مسلمان سٹاف کا جینا محال کر دیا۔ ذرا ذرا سی غلطی پر چارج شیٹیں بننے لگیں اور ایک دن معلوم ہُوا کہ ہمارا پڑوسی بھی ہندو کے شکنجے میں جکڑا گیا ہے۔ اُس کا تو سارا سلسلہ ہی حرام خوری پر چل رہا تھا لیکن وہ ہندوؤں کو پورا حصّہ دیتا تھا اور ہندو اُس کے شریک کار تھے۔ اُسے ان لوگوں پر بہت بھروسہ تھا مگر ہمیں پتہ چلا کہ اُس کے دو ٹھیکے ضبط ہو گئے ہیں اور اُس کے خلاف مقدمہ درج کر لیا گیا ہے۔ ہم نے اُسے پریشانی کی حالت میں مارا مارا پھرتے دیکھا پھر یہ بھی دیکھا کہ اُس کی بیوی اور بیٹی تو شام کے بعد باہر نکل جاتی تھیں لیکن ان کی کوٹھی میں اب ہندوؤں اور سکھوں کی پہلے والی رونق نہیں ہوتی تھی۔

ہندوؤں نے اُسے ایسے شکنجے میں جکڑا تھا کہ اُس کی دولت مقدمے سے بچ نکلنے کے لیے پانی کی طرح بہنے لگی۔ اُس کے ٹھیکے ٹھپ ہو گئے اور اُس نے دو کوٹھیاں بیچ ڈالیں۔ اُس وقت ہم نے اُسے ایک بار پھر کہا کہ اب بھی باز آ جاؤ تو مسلمان شاید تمہاری کچھ مدد کرنے پر آمادہ ہو جائیں مگر وہ ہندوؤں کی ہی خوشامدوں میں لگا ہُوا تھا۔ ہمیں معلوم ہُوا کہ اُسے دو ہندوؤں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہمیں تمہارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں، تم اب بھی ہمارے دوست ہو لیکن ہمیں مسلمانوں سے دشمنی ہے اور تم مسلمان ہو۔

ہمارے اس مسلمان بھائی نے مقدمے سے تو جان چھڑا لی لیکن اس کے پاس صرف وہی ایک کوٹھی رہ گئی جو اُس نے باپ دادا کی حویلی کو گرا کر کھڑی کی تھی۔ وہ بے روزگار ہوگیا۔ جو تھوڑا بہت پاس بچتے رہ گیا تھا، وہ اُس نے ایک مسلمان دوکاندار کو دے کر اُس سے حصہ داری کر لی جس سے وہ بھوکا مرنے سے بچ گیا۔ کار بھی نہ رہی اور دونوں بیٹے بھی جیتے جی مر گئے۔ انہیں اب شراب نہیں ملتی تھی لیکن نشہ پورا کرنے کے لیے وہ چرس پینے لگے تھے۔ محلّے کے مسلمانوں نے دونوں کو واپس اپنے مقام پر لانے کی کوشش کی لیکن اب وہ مکمل طور پر چرسی اور جواری بن چکے تھے۔

آخر ہمارا پڑوسی تھک ہار کر مسلمانوں کے قدموں میں آن گرا۔ اُس کی بیوی کی سُرخی اور لپ سٹک دُھل گئی اور بیٹی بھی گھر بیٹھ گئی لیکن وہ جوان تھی اور خودسر بھی، اس لیے کبھی کبھار باہر نکل جاتی تھی۔ ایک روز اُس کا باپ میرے پاس آکر زار و قطار رو دیا اور کہنے لگا کہ بیٹے تو ہاتھ سے نکل گئے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا بھلا آدمی مل جائے جو میری بیٹی کو بیاہ لے جائے۔

اُس دَور میں مسلمانوں نے پاکستان کے نام پر متحد ہو کر آپس کے تفرقے مٹا دیے تھے اور وہ قیامِ پاکستان کے نام پر جان و مال کی قربانیاں دے رہے تھے۔ ہندوستان میں رہ کر کوئی بھی مسلمان کسی مسلمان کو ذلیل ہوتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہم سب محلّے دار اس پڑوسی کی بیٹی کے رشتے کے لیے بھاگ دوڑ کرنے لگے۔ ہماری نظر ایک جواں سال آدمی پر پڑی جس کا باپ مر چکا تھا اور اب اُس کی ماں ہی ماں اِس دُنیا میں رہ گئی تھی۔ وہ ایک پڑھا لکھا جوان تھا اور جذباتی بھی۔ معمولی سی تنخواہ لیتا تھا جو ماں بیٹے کے لیے کافی تھی۔ وہ ہمارے شہر کے ایک دُور دراز کے محلّے میں رہتا تھا۔ میں نے اُس سے بات کی تو وہ کہنے لگا کہ لڑکی یقیناً آوارہ ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ آوارہ تھی مگر اب نہیں۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ یہی تو نیکی ہے کہ ایک گمراہ مسلمان لڑکی کو راہِ راست پر لانا ہے۔

اُس کے کردار کی بلندی کو دیکھئے کہ میری اس دلیل پر اُس نے آمادگی ظاہر کر دی۔ میرا بیٹا اُس وقت چھوٹا تھا ورنہ میں اس لڑکی کو بہو بنا لیتا۔ لڑکی کے ماں باپ

نے امیری کے زمانے میں ہمیں جس طرح دُھتکارا تھا، اس کے جواب میں ہمیں یہی کچھ کرنا چاہیئے تھا کہ اُسے ذلیل ہونے دیتے لیکن ہم کفرستان میں تھے جہاں ہم ایک مسلمان بیٹی کی تباہی کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ملک میں حالات ایسے ہو گئے تھے کہ مسلمانوں کو ایک قوم کی حیثیت سے اپنے وقار کا تحفظ کرنا تھا۔ خدا خوش رکھے اس جوان کو جو ایثار پر آمادہ ہو گیا اور ایک روز جس کوٹھی میں دولت، شراب میں بہتی تھی اور جہاں قہقہے گونجا کرتے تھے اور جہاں ہر رات تین چار کاریں کھڑی رہتی تھیں وہاں ہم چند ایک مسلمانوں نے بیٹھ کر نہایت خاموشی سے لڑکے اور لڑکی کا نکاح پڑھا دیا۔ لڑکا عام کپڑوں میں تانگے میں آیا تھا اور لڑکی کو تانگے میں بٹھا کر لے گیا۔

ہم سمجھے کہ ایک مسئلہ حل ہو گیا ہے مگر معلوم ہُوا کہ مسئلہ تو اب شروع ہُوا ہے۔ لڑکی کو ہم اکثر اپنے ہی گھر دیکھا کرتے۔ اُس کے خاوند سے کبھی کبھار ملاقات ہوتی تھی۔ اُس سے جب بھی پوچھا کہ ازدواجی زندگی کیسے گزر رہی ہے تو وہ کہتا کہ اللہ کا فضل ہے، وقت گزر رہا ہے۔ پانچ چھ مہینے بعد اُس کے ایک دوست سے پتہ چلا کہ لڑکی نے اُسے انتہائی شرمناک آزمائش میں ڈال رکھا ہے۔ وہ اُسے کہتی ہے کہ میں تو امیر باپ کی بیٹی ہوں۔ میں تمہاری ماں کی خدمت نہیں کر سکتی۔ میرے گھر میں چھ چھ نوکر ہُوا کرتے تھے۔ خاوند نے اُسے کبھی بھی نہ کہا کہ اب تمہارا باپ کوڑی کوڑی کا محتاج ہے اور اُس کے گھر میں ایک بھی نوکر نہیں ہے۔ اُسے احساس تھا کہ لڑکی بے قصور ہے۔ ماں باپ نے دولت کے نشے میں اُسے کچی عمر میں عیش و عشرت اور بے حیائی کا عادی بنا دیا ہے اور وہ اپنے بھائیوں کی طرح نشے کی عادی ہو گئی ہے۔ اس خیال سے اس صاحبِ کردار نے لڑکی کو گناہگار ہوتے ہوئے بھی بے گناہ تصوّر کیا اور اُس کی ہر بات مانتا چلا گیا۔ اس دوران وہ اُسے محبّت اور عزّت کے واسطے دیتا رہا۔ لڑکی کبھی تو اچھی بھلی گھریلو عورت بن جاتی اور کبھی اس پر دولت مندی کے زمانے کا بھُوت سوار ہو جاتا۔

ایک روز اُس کے خاوند کو کسی کے بتانے پر علم ہو گیا کہ لڑکی ایک آدمی سے ملتی ہے اور اکثر شام اُس کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ وہ کار لیے کسی جگہ اُس کے انتظار میں ہوتا تھا جہاں لڑکی اُس سے جا ملتی تھی اور دونوں رات دیر تک کہیں غائب

رہتے تھے۔ ایک رات لڑکی نے خاوند سے کہا کہ اپنے ماں باپ کے گھر جا رہی ہوں، صبح واپس آؤں گی۔ خاوند نے اجازت دے دی اور اُس کا تعاقب کرنے لگا۔ وہ پیدل چلتی گئی اور خاوند اُس سے خاصی دُور پیچھے اُسے دیکھتا رہا۔ ایک جگہ سڑک کے کنارے ایک کار کھڑی تھی۔ وہ کار کے قریب پہنچی، کار کا دروازہ کھُلا اور لڑکی کار میں داخل ہو گئی۔ اُس کا خاوند وہیں سے واپس آ گیا۔

لڑکی دوسری صبح واپس آئی۔ اُس کے پاس شلوار اور قمیض کا ریشمی کپڑا تھا۔ خاوند نے پوچھا تو کہنے لگی کہ ماں نے دیا ہے۔ خاوند نے اُسے کچھ بھی نہ کہا اور شام اُس کی ماں سے پوچھا تو ماں نے کہا کہ وہ یہاں تو آئی ہی نہیں تھی۔ اُس نے اپنی ساس کو اور کچھ نہ کہا لیکن اتنا ضرور کہا کہ تمہاری بیٹی تمہارے گناہوں کی سزا بھگت رہی ہے۔ اُسے بے حیائی کی راہ پر تم نے ڈالا ہے۔ تم تو پہلے بھی دال ساگ کھاتے تھے اور اب بھی دال ساگ کھا سکتے ہو لیکن تمہاری بیٹی اب دال ساگ کو قبول نہیں کرتی۔ یہ تمہارا جرم ہے۔

اُس نے اُسی رات لڑکی کو الگ کمرے میں لے جا کر کہا کہ کوئی خاوند خواہ کتنا ہی غریب اور کمزور کیوں نہ ہو، وہ بدکار بیوی کو گھر میں نہیں رکھ سکتا۔ مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ تمہیں اٹھا کر گلی میں پھینک دوں اور لوگوں کو بتاؤں کہ یہ فاحشہ اور بدکار عورت ہے۔ میں اُس آدمی کو لوگوں کے سامنے کھڑا کر سکتا ہوں جس کے ساتھ تم جاتی ہو لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ تم جیسی کیسی بھی ہو، میں تمہیں ایک مسلمان لڑکی سمجھتا ہوں اور میں ایک مسلمان لڑکی کی خاطر یہ ایثار کر رہا ہوں۔ اگر تم اب بھی اپنے آپ میں آ جاؤ تو میں سب کچھ بھول جاؤں گا۔

لڑکی کے آنسو نکل آئے اور اُس نے کہا کہ وہ اس بے حیائی اور بدکاری کی عادی ہو چکی ہے۔ نہ حرام کی دولت گھر میں آتی نہ میں ننگی ہوتی۔ اب کے بخش دو، میں آئندہ ایسا نہیں کروں گی۔ خاوند نے اُسے نہلایا اور دو نفل پڑھنے کو کہا۔ جب وہ نہا کر نفل پڑھ چکی تو خاوند نے اُس کے سامنے قرآن رکھ دیا۔ لڑکی نے قرآن کی قسم کھا کر راہِ راست پر آنے کا وعدہ کر لیا۔

وہ پندرہ بیس دن تک اپنے ماں باپ کے ہاں بھی نہ گئی اور اُداس اُداس

رہی۔ خاوند اُسے پکچر دکھانے بھی دو تین دفعہ لے گیا۔ وہاں وہ خوش رہی مگر گھر آ کر پھر وہی اُداسی۔ ایک روز خاوند نے اُسے کہا کہ چند دنوں کے لیے میکے چلی جاؤ۔ وہ اُسی روز میکے چلی گئی۔ دوسری شام اُس کا خاوند اُسے دیکھنے اُس کے ماں باپ کے ہاں گیا۔ وہ اُن کی کوٹھی سے دُور ہی تھا کہ سڑک کی بتی کی روشنی میں اُس نے اپنی بیوی کو باہر نکلتے اور ایک طرف جاتے دیکھا۔ وہ بھی اُس کے پیچھے چل پڑا۔ محلے سے نکل کر وہ کھُلی سڑک پر گئی تو وہاں کار کھڑی تھی۔ لڑکی کار میں بیٹھ گئی اور کار چلی گئی۔

خاوند اپنے گھر چلا گیا۔ چار روز بعد اُس کی بیوی اُس کے گھر گئی تو خاوند نے اُسے کہا کہ جس مسلمان کی آنکھوں میں قرآن کی بھی کوئی وقعت نہیں اُس پر مجھ جیسے انسان کی کوئی بات اثر نہیں کر سکتی۔ اب بہتر یہی ہے کہ تم اپنے گھر چلی جاؤ۔ میرے گھر سے جو کچھ لے جانا چاہو لے جاؤ۔ لڑکی نے طنز بھرے لہجے میں اُسے کہا "تمہارے گھر میں ہے ہی کیا؟ تم مجھے جس سے ملنے سے روکتے ہو اُس کی اپنی کار ہے اور جتنی تم تنخواہ لیتے ہو اتنی تنخواہ وہ اپنے نوکروں کو دیتا ہے۔ تم مجھے طلاق دے دو۔ وہ مجھ سے شادی کر لے گا۔ تمہیں معلوم نہیں وہ مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے"۔

خاوند نے کہا کہ پھر تم میرے ساتھ اپنی زندگی کیوں تباہ کرنے آئی تھیں؟ کل تمہیں تحریری طلاق بھیج دوں گا۔ اُس نے اُسے یہ بھی کہا کہ نہ تمہیں اُس سے محبت ہے نہ اُسے تم سے۔ تمہیں اُس کی کار اور دولت سے اور اُسے تمہارے حُسن اور تمہارے جسم سے محبت ہے اور اس لیے بھی کہ تم اُسے آسانی سے مل جاتی ہو۔ تم اپنی عصمت بیچ رہی ہو اور وہ تمہیں قیمت دے رہا ہے۔ بہرحال یہ باتیں تمہیں وقت سمجھائے گا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جب کبھی اُس نے تمہیں ٹھکرا دیا یا تم پر کوئی مشکل وقت آن پڑا، تم بلا جھجک میرے پاس آ جانا۔ میں تمہیں کوئی طعنہ نہیں دوں گا۔ سچے دل سے پناہ میں رکھوں گا، لیکن لڑکی اُسے طعنہ اور چیلنج دے کر چلی گئی۔

ہمیں پتہ چلا تو اُس کے خاوند سے ملے اور افسوس کا اظہار کیا۔ اُس نے نہایت تحمّل سے کہا کہ مجھے اس کا افسوس نہیں کہ میری ازدواجی زندگی تباہ ہوئی ہے بلکہ افسوس اس حادثے پر ہے کہ ایک مسلمان لڑکی تباہ ہو گئی ہے جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، یہ شخص تحریکِ پاکستان کا سرگرم رُکن بلکہ جانباز مجاہد تھا اور

اسلام کے نام پر مر مٹنے کو تیار رہتا تھا۔ کسی ہندو کے مُنہ سے پاکستان کے خلاف کوئی بات نکل جائے تو پہلے اُس کے مُنہ پر گھونسہ مارتا تھا پھر اگر بات کرنے کی فضا قائم رہے تو ہندو کو سمجھاتا تھا کہ پاکستان بن کر رہے گا۔ اس لحاظ سے وہ بدمزاج اور لڑاکا تھا۔ وہ کسی مسلمان کی بھی ایسی ویسی بات برداشت نہیں کیا کرتا تھا لیکن ایک مسلمان لڑکی کی خاطر اُس نے جو ایثار کیا وہ صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ اُس کی بدکاری کے باوجود اُسے گھر میں رکھنے کی پوری کوشش کی بلکہ بعد میں انکشاف ہُوا کہ اُسے ایک شریف گھرانے کی لڑکی سے محبت تھی اور وہ لڑکی بھی اُسے دیوانہ وار چاہتی تھی۔ وہ لڑکی بھی تحریکِ پاکستان کی مجاہدہ تھی۔ اس آدمی نے اس لڑکی کی محبت کو قربان کر کے اس آوارہ لڑکی سے شادی کی تھی۔ جب میں نے اُس سے بات کی کہ اب تو لڑکی اُسے قبول نہیں کرے گی تو وہ کہنے لگا کہ نہیں وہ میرے ساتھ شادی کرے گی کیونکہ اُسے اچھی طرح علم ہے کہ میں نے ایثار کیا تھا۔

لڑکی کو طلاق مل گئی۔ باپ نے اُسے مارا پیٹا بھی لیکن وہ اپنی راہ سے نہ ہٹی۔ چھ سات ماہ بعد اس آدمی نے اُس لڑکی کے ساتھ شادی کر لی جس سے اُسے محبت تھی۔ تھوڑے ہی دن گذرے ہوں گے کہ قیامِ پاکستان کا اعلان ہو گیا۔ ہم نے پہلی بار آل انڈیا ریڈیو پر قائداعظمؒ کی آواز سُنی۔ اس سے اگلے ہی روز ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں پر حملے شروع کر دیے اور جگہ جگہ سے مسلمانوں کے قتلِ عام کی خبریں آنے لگیں۔ مسلمانوں کے لیے پاکستان ہی پناہ گاہ تھی۔ اُنہیں اب وہیں جانا تھا لیکن پاکستان بہت دُور تھا۔ مسلمانوں پر دہشت طاری تھی اور اتنی دُور سے پاکستان تک زندہ پہنچ جانا ممکن نظر نہ آتا تھا۔

ہم بدستور دفتروں میں جا رہے تھے۔ ہندو اور سکھ ہم سے بات بھی نہیں کرتے تھے۔ ایک روز مجھے ہیڈ کلرک نے اپنے پاس بُلایا۔ وہ ہندو تھا۔ اُس نے نہایت شفقت سے بات کی اور کہا کہ دیکھو میرے بھائی تمہارے لیڈروں نے تمہیں مروانے کا پُورا بندوبست کر لیا ہے۔ تم ذرا سوچو کہ تم اتنی دُور پاکستان تک کس طرح پہنچو گے؟ تم میری مانو، اپنا مذہب بدل لو۔ ایک تو محفوظ رہو گے، دوسرے ترقی کر جاؤ گے۔ تم پاکستان چلے بھی گئے تو تمہیں واپس آ جاؤ گے۔ یہ پاکستان دو دن

کا کھیل ہے۔ فوجیں ہمارے پاس ہیں، خزانہ ہمارے پاس ہے، وہ دریا ہمارے پاس ہیں جن سے تمہارے پاکستان کی نہریں نکلتی ہیں۔ تمہارا قائداعظم مجبور ہو کر ولایت بھاگ جائے گا اور پاکستان پھر ہندوستان بن جائے گا۔ تم اپنے دوستوں سے بھی کہو کہ ہندو مت قبول کر لو۔ اس سے اچھا مذہب ساری دُنیا میں نہیں ہے۔

میں نے اس ہندو کو جو جواب دیا اس کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں۔ میرے جواب کے جواب میں اُس نے مجھے جو دھمکی دی اسے بھی الگ رہنے دیجیے۔ مطلب کی بات یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہُوا کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کی منظم تحریک شروع کر دی ہے۔ بہرحال مسلمان اس کے خلاف ایک محاذ پر جمع ہو کر ہندو کی اس سازش کے خلاف سرگرم ہو گئے۔ اس کے بعد آپ سب نے دیکھ لیا کہ مسلمانوں نے جانیں اور آباؤ اجداد کی جائیدادیں قربان کر دیں، اپنے بچے مروا لیے اور ہندو کی اس شرمناک پیش کش پر تھوک کر پاکستان آ گئے۔

ہمارے پڑوسی کا سابق داماد جس نے دوسری شادی کر لی تھی، ہم ۱۴ اگست سے چند دن پہلے ہی سرکاری ریل گاڑی میں اپنے محکمے کے مسلمان عملے کے ساتھ پاکستان کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہ اپنی بیوی اور ماں کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ تین چار روز بعد ہمیں یہ ہولناک خبر ملی کہ اس گاڑی کے تمام مسافروں کو راستے میں ہندو اور سکھوں نے کاٹ دیا ہے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ بھٹنڈہ ریلوے سٹیشن کے قریب ہندوؤں نے اس گاڑی کو ڈائنامیٹ سے تباہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ڈائنامیٹ وقت پر پھٹا تھا جس سے بہت سے مسلمان شہید اور زخمی ہو گئے تھے۔ باقی بچ گئے تھے۔

ہم بھی سرکاری ملازم تھے لیکن مسلمانوں کا قتلِ عام اس قدر تیزی سے بڑھ رہا تھا کہ سرکاری طور پر ہمیں پاکستان کے لیے گاڑی ملنے کا کوئی انتظام نہیں ہو رہا تھا کیونکہ بدنظمی زیادہ ہو گئی تھی۔ آخر محلے والوں نے فیصلہ کیا کہ ٹرکوں کا بندوبست کیا جائے۔ ایک ٹرک تو سرکاری طور پر ملنے کی امید بندھ گئی اور دو مسلمان مل گئے جن کے [illegible] چار اپنے ٹرک تھے۔ وہ ان ٹرکوں کو بھی پاکستان لانا چاہتے تھے۔ خدا انہیں اس نیکی کا اجر دے کہ وہ ہمارے محلے کی مسلمان آبادی کو بلامعاوضہ ٹرکوں میں پاکستان لانے پر

رضامند ہو گئے۔ ہمیں دو تین روز بعد وہاں سے روانہ ہونا تھا۔

ایک رات ہمارے پڑوسی کی بیٹی جو مطلقہ بیوی تھی چیختی چلاتی ہمارے گھر آئی۔ اُس نے بتایا کہ چھ سات ہندو اُس کے گھر میں گھس آئے ہیں اور لُوٹ رہے ہیں۔ اتنے میں اُس کی ماں کی چیخیں سُنائی دیں۔ یہ لڑکی دُوسرے کمرے میں تھی۔ وہیں سے بھاگ کر ہمارے ہاں آ گئی تھی۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ محلے کے مسلمان لاٹھیاں، چاقو اور جو ہاتھ لگا، اُٹھا کے نکل آئے۔ ہندوؤں کو شک تھا کہ اس مسلمان کے گھر بہت دولت اور زیورات ہوں گے۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ وہ تو کنگال ہو چکا تھا۔ یہ لڑکی بجائے خود ہندوؤں کے لیے خوب صورت کشش تھی۔ اُس وقت قانون ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا۔ محلے کے مسلمانوں نے کوٹھی پر ہلہ بول دیا۔ اندر آٹھ ہندو ٹرنکوں کو توڑ پھوڑ رہے تھے اور لڑکی کے باپ اور اُس کی ماں کو قتل کر چکے تھے۔ دونوں کی لاشیں خون میں ڈوبی ہوئی ایک کمرے کے دروازے میں اکٹھی پڑی تھیں۔ مسلمانوں نے آٹھ میں سے چار ہندوؤں کو تو وہیں جان سے مار دیا۔ دو زخمی ہو کر نکل گئے اور دو صحیح سلامت جانے کدھر سے فرار ہو گئے۔

لڑکی کو میں نے اپنے گھر رکھ لیا۔ وہ رو رو کر غش پہ غش کھاتی تھی۔ میری بیوی اور بچیوں نے بڑی مشکل سے اُسے سنبھالا اور اُسے بتایا کہ ابھی تو ہم سب کو شہید ہونا ہے۔ اُس کے ماں باپ کو ہم قبرستان تک نہیں لے جا سکتے تھے۔ چنانچہ ہم نے کوٹھی کے باہر جنازہ پڑھا اور کوٹھی کے صحن میں انہیں پہلو بہ پہلو دفن کر دیا۔ ہم فارغ ہوئے ہی تھے کہ معلوم ہوا کہ ہندوؤں کا ایک ہجوم چار ہندوؤں کے خون کا بدلہ لینے محلے میں داخل ہو چکا ہے۔ ہم موت کے لیے تو تیار ہی تھے۔ محلے میں دو، دونالی بندوقیں، ایک پستول اور باقی کلہاڑیاں اور چاقو تھے۔ تین آدمی دو دونالی بندوقوں اور ایک پستول سے مسلح نہایت دلیری سے ہندوؤں کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ ہندو ایک گلی میں ہجوم کیے ہوئے تھے۔ ان میں سکھ بھی تھے۔ ان کے پاس چند ایک بندوقیں بھی تھیں۔ باقی برچھیاں اور کرپانوں سے مسلح تھے۔

ان تین جانباز مسلمانوں میں سے ایک نے کافروں کے ہجوم کے سامنے کھڑے ہو کر کہا "دوستو! ہمیں معلوم ہے کہ ہمیں یہیں مرنا ہے اس لیے ہم مرنے سے

نہیں ڈرتے۔ تمہیں اتنا بتا دیتے ہیں کہ ہمارے مورچے تیار ہیں۔ ہمارے پاس گرینیڈ بھی ہیں۔ ہماری عورتیں بھی مسلح ہیں اور لڑیں گی۔ آدھے محلے کے پاس بندوقیں ہیں۔ ہمیں مسلمان فوجی پاکستان جاتے ہوئے بہت اسلحہ اور ایمونیشن دے گئے ہیں۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو یہیں سے واپس چلے جاؤ۔ اگر ہمت ہے تو آؤ، ہم تین ہیں۔ ہمیں کوئی ہندو یا سکھ آگے آ کر ہاتھ لگا کر دیکھے کہ کیا ہوتا ہے۔"

سکھوں کی للکار سُنائی دی اور بہت شور وغل ہُوا۔ تینوں مسلمان واپس آ گئے۔ ہمارے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ عورتوں کو ہم نے چھتوں پر چڑھا دیا کہ ہندو سکھ گلیوں میں آئیں تو وہ اُوپر سے اینٹیں ماریں۔ ہم گلیوں میں لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو گئے لیکن ہندو اور سکھ ہمیں دھمکیاں دے کر چلے گئے۔ وہ ڈر گئے تھے۔ ہم نے اسی شام ٹرکوں کا بندوبست کر لیا۔ سرکاری ٹرک تو نہ مل سکا، تین پرائیویٹ ٹرک آ گئے اور ہم صرف جانیں لے کر وہاں سے نکلے۔ زیورات، نقدی اور پہنے ہُوئے کپڑوں کے سوا ہم وہاں سے اور کچھ بھی نہ لائے۔

یہ تین ٹرک تقریباً ایک ایک سو مردوں، عورتوں اور بچوں کو اُٹھائے رات بھر چلتے رہے۔ بڑا ہی تکلیف دہ سفر تھا۔ مرد کھڑے تھے اور عورتیں بچوں کو گود میں لیے بیٹھی رہیں۔ صبح ہوئی تو ہم پاکستان سے زیادہ دُور نہیں تھے لیکن ہم لاشوں کے دیس میں چلے جا رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف مہاجرین کے کٹے ہوئے قافلوں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور دہشت زدہ تھکے ماندے قافلے قدم گھسیٹتے پاکستان کی سمت چلے جا رہے تھے۔ بہت ہی دردناک اور ولولہ انگیز منظر تھا۔ یہ خون پاکستان کے لیے بہہ رہا تھا اور یہ خون ہندو بہا رہا تھا۔ آج کوئی ہمیں کہے کہ ہندو سے دوستی کر لو تو ہم کیسے کر سکتے ہیں۔ جب ہندو کا نام سنتے ہیں تو خون اُبلنے لگتا ہے۔

ہم آخر پاکستان پہنچ ہی گئے اور نئے گھروں کی تلاش میں ہمارا قافلہ بھی بکھر گیا۔ جہاں پناہ ملی وہیں جا پہنچے۔ مجھے اچھا مکان مل گیا۔ میں سرکاری ملازم تھا۔ اپنے محکمے کے دفتر گیا اور ملازمت پھر شروع ہو گئی۔ ہندوؤں سکھوں کے چلے جانے کی وجہ سے ترقی بھی جلدی مل گئی۔ زندگی ایک نئی اور مقدس ڈگر پر چل پڑی۔

ناہید کو میں نے اپنے پاس ہی رکھ لیا تھا۔ اُس کا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ

بہت روتی تھی لیکن میں نے اُسے کچھ ایسے پیار سے اپنے گھر کا فرد بنا لیا کہ وہ مطمئن ہو گئی لیکن وہ ایک بوجھ اُٹھائے پھرتی تھی۔ اُس کے پیٹ میں چار ماہ کا بچہ تھا۔ یہ بچہ اُس کے ضمیر پر بھی بوجھ تھا کیونکہ یہ اُس کے اُس گناہ کا نتیجہ تھا جس کی وہ طلاق کے بعد ماں باپ کے گھر مرتکب ہوئی تھی۔

اب وہ پچھتاوے سے بھی روتی تھی۔ ایک روز میں نے اپنے پاس بٹھا کر اُسے بہت تسلیاں دیں۔ اُس نے مجھے کہا کہ میں نے جس شخص کی محبت کے دھوکے میں اتنے اچھے خاوند سے طلاق لے لی تھی، اُس نے وعدے کے باوجود شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ میں اب اسی فریب کار کے بچے کو پیٹ میں اُٹھائے پھرتی ہوں۔ میں نے خودکشی کی بھی سوچی تھی لیکن ماں باپ قتل ہو گئے اور ہم یہاں آ گئے۔ اب چاہتی ہوں کہ اس بچے کو جنم دے کر مر جاؤں لیکن اس ناجائز بچے کو کون سنبھالے گا؟ جب یہ سوچتی ہوں تو اسی ایک فیصلے پر پہنچتی ہوں کہ بچے کو ساتھ لیے قبر میں جا چھپوں۔

وہ زار و قطار رو رہی تھی اور گناہوں پر بہت نادم تھی اور اپنے خاوند کو بہت یاد کرتی تھی۔ بار بار کہتی تھی کہ وہ اُس کے خلوص اور ایثار کا مذاق اُڑاتی رہی۔ وہ اُسے ایک بار مل کر اُس کے قدموں میں سر رکھ کر معافی مانگنا چاہتی تھی اور مجھ سے پوچھتی تھی کہ وہ کہاں ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ اُس کے متعلق مجھے کوئی پتہ نہیں حالانکہ وہ اسی شہر میں تھا اور ایک بچے کا باپ بن چکا تھا۔ وہ نہایت مطمئن زندگی بسر کر رہا تھا۔ بہرحال میں نے ناہید کے ضمیر سے گناہ کا بوجھ اُتارنے کی پوری کوشش کی اور اُسے ذہن نشین کرایا کہ وہ بے قصور ہے اور اپنے ماں باپ کے گناہوں کی سزا بھگت رہی ہے۔ میں اور میرا کنبہ اُسے جس قدر پیار اور شفقت دے سکتا تھا، دی لیکن وہ اکثر روتی رہتی تھی۔ اُسے کھانے پینے کا بھی کوئی ایسا خیال نہ تھا۔ میری بیوی اُسے یہ بات کہہ کر کھانا کھلایا کرتی تھی کہ اپنے لیے نہیں تو ہونے والے بچے کے لیے کچھ کھا پی لیا کرو۔ بس یہی ایک حیلہ تھا جو اُسے کھانے پر آمادہ کیا کرتی تھی۔

اُس کا سابق خاوند اسی شہر میں تھا جہاں میں آ کر آباد ہوا تھا۔ میں نے اُسے ناہید اور اُس کی ذہنی اور جسمانی کیفیت کے متعلق بتا دیا تھا۔ آخر بچے کی پیدائش کا وقت

آ گیا۔ وہ کھانا کم کھانے اور ہر وقت اُداس اور پریشان رہنے کی وجہ سے بہت کمزور ہو گئی تھی۔ جُوں جُوں وقت قریب آ رہا تھا، وہ مجھے التجا کے لہجے میں بار بار کہنے لگی — ”میرا بچہ آپ کے پاس خدا کی امانت ہو گا۔ اسے یہ نہ بتانا کہ اس کی ماں کیسی تھی“ — میں نے اُسے بہت سمجھایا کہ وہ انشاء اللہ زندہ رہے گی اور بچے کو اسی گھر میں خود پالے گی لیکن وہ تو جیسے فیصلہ کر چکی تھی کہ بچے کو وہ میرے حوالے کر کے خود اس دُنیا سے رخصت ہو جائے گی۔

ہُوا بھی ایسے ہی۔ اُس نے بچی کو جنم دیا اور دوسرے دن مر گئی۔ خون کی ضرورت تھی جو میں نے بھاگ دوڑ کر پوری کر لی تھی لیکن ڈاکٹر اُسے بچا نہ سکے۔ ہم نے بچی کو سنبھال لیا۔ میں نے ناہید کے سابق خاوند کو بتایا کہ ناہید بچی کو جنم دے کر مر گئی ہے تو اُس کے آنسو نکل آئے۔ اُس نے دوٹوک لہجے میں کہا — ”بچی مجھے دے دو“۔ میں نہیں دینا چاہتا تھا لیکن اُس نے ایسی ضد کی کہ میں اُسے گھر لے آیا اور وہ بچی کو اُٹھا لے گیا۔ آج کے معاشرے میں وہ مجھے عجیب سا انسان لگتا ہے۔ مجھے کہنے لگا کہ میں گناہ کو نیکی کا روپ دوں گا۔

اور آج تیس برس بعد میں گناہ کو نیکی کے رُوپ میں دیکھ رہا ہوں۔ اُس کی بیوی نے بچی کو پالا اور چند دن ہوئے اُس کی شادی اپنے پہلے بیٹے کے ساتھ کر دی ہے۔ اُس کی بیوی بچی کی ماں کے متعلق سب کچھ جانتی تھی۔ اُس نے بھی خلوص سے تعاون کیا اور بچی کو نہایت اچھی تربیت دی تھی۔

جب شادی طے پائی تو یہ مشکل پیش آ گئی تھی کہ دولہا اور دلہن ایک دوسرے کو سگے بہن بھائی سمجھتے تھے۔ لڑکی کو یہ نہیں بتایا جا سکتا تھا کہ اُس کی ماں کون تھی اور کیا تھی۔ اُسے یہ بتایا گیا کہ اُس کے ماں باپ ہندوستان سے آتے راستے میں شہید ہو گئے تھے۔ اُس وقت اُس کی عمر ایک مہینہ تھی اور اُسے یہ لوگ اُٹھا لائے تھے۔ معلوم ہُوا کہ دولہا اور دلہن کو دُکھ ہُوا تھا لیکن دلہن نے اس حقیقت کو قبول کر لیا اور غصے کے عالم میں کہا — ”میرے بچے میرے ماں باپ کے خون کا انتقام لیں گے!“

لیکن اُس کے بچوں کو تو کبھی بھی پتہ نہیں چل سکے گا کہ اُن کی ماں کا قاتل کون ہے!

جب میرا ایمان نیلام ہُوا

رشوت کو ہم سب نے مِل جُل کر اُس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں اُس کا لین دین معیوب نہیں سمجھا جاتا، بلکہ یہ شک بھی ہونے لگا ہے جیسے رشوت کو سرکاری طور پر جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ محلّے اور برادری میں عزت اُسی کو حاصل ہوتی ہے جو حویلی یا کوٹھی کا مالک ہو اور جس کے پاس دولت ہو۔ غریب یا متوسط طبقے کا آدمی کتنا ہی دانشمند اور مخلص کیوں نہ ہو اُس کی کوئی نہیں سُنتا۔ اس کے مقابلے میں امیر آدمی سے لوگ مشورے لینے اور اُس کی بات مانتے ہیں۔ لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس شخص کی دولت حرام کی ہے، رشوت کی ہے یا دیگر ناجائز ذرائع سے چلی آ رہی ہے۔ میں اس سوچ میں غرق رہنے لگا ہوں کہ خدا کی لاٹھی جسے بے آواز کہتے ہیں کیوں حرکت میں نہیں آتی۔

میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ ایک بیٹا یاد آتا ہے۔ وہ زندہ ہوتا تو بڑھاپے کا سہارا بنتا۔ اب دو بیٹیاں شادی شدہ ہیں۔ میرا گزارہ چند ایک بچّوں کی ٹیوشن پر چلتا ہے۔ اس مہنگائی میں اس آمدنی سے دو وقت روٹی بھی میسّر نہیں آتی۔ البتہ ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں، مگر اب ضمیر اس سوال پر پریشان رہنے لگا ہے کہ خُدا نے گناہگاروں کو کھُلی چھٹی دے رکھی ہے اور مجھے ایک غلطی کی سزا اتنی سخت کیوں دی ہے۔

پاکستان سے پہلے میں سکول ٹیچر ہُوا کرتا تھا۔ ٹیچر اُس وقت بھی غریبوں کی فہرست میں آتے تھے لیکن اس پیشے کو لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

میرے باپ کی عمر کے لوگ بھی احترام سے سلام کرتے تھے۔ کوئی ٹیچر کسی قسم کی جھک نہیں مارتا تھا۔ طلباء اپنے اُستادوں کو پیر اور مُرشد سمجھتے تھے۔ پرچوں میں سفارشی نمبر دینے کی کبھی کسی نے نہیں سوچی تھی۔ جنگِ عظیم کے اثرات نازل ہوئے تو مہنگائی بڑھ گئی۔ اس سے بعض اُستادوں نے مجبور ہو کر ٹیوشن کا کاروبار شروع کر دیا تھا لیکن آج کل کی طرح وہ ایسی سودا بازی نہیں کرتے تھے کہ جو کسی اُستاد کے پاس ٹیوشن رکھے گا اُسے وہ اُستاد پاس بھی کرا دے گا، لڑکا خواہ کتنا ہی نالائق کیوں نہ ہو۔ آج کل آپ نے ٹیوشن پڑھانے والے پرائیویٹ اداروں کے اشتہار اور بورڈ دیکھے ہوں گے جن پر یہ الفاظ لکھے ہوتے ہیں ـــ "پاس کرانے کی گارنٹی"۔

پاکستان میں آکر تعلیم کا جو حشر ہُوا وہ آپ کے سامنے ہے۔ یہ تباہی آزادی کے فوراً بعد شروع ہو گئی تھی۔ آج کل آپ جعلی ڈگریوں اور سندوں کے کاروبار اور چند افراد کی گرفتاری کی جو خبریں پڑھ رہے ہیں یہ کوئی نئی اور عجیب و غریب نہیں۔ بیس سال پہلے بھی کچھ حضرات پکڑے گئے تھے جن میں ایک غیر ملکی (غالباً برطانوی) تھا جو پنجاب یونیورسٹی میں کسی عہدے پر فائز تھا۔ اُس نے اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ بعض میٹرک پاس افراد کو ایم۔ اے کی جعلی ڈگریاں دے چکا ہے اور اُن میں سے کئی ایک سرکاری دفاتر میں اچھے عہدوں پر پہنچ چکے ہیں۔ اب یہ حال ہے کہ افراد پکڑے جاتے ہیں مگر یہ غیر قانونی اور غیر اخلاقی کاروبار ختم نہیں ہوتا بلکہ روز بروز فروغ حاصل کرتا جا رہا ہے۔

میں آپ کو چونکہ ایک مختلف واقعہ سُنانے لگا ہوں اس لئے تعلیم، تعلیمی اداروں اور استادوں وغیرہ کے متعلق زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ مجھ پر جو گزری ہے اسے آپ چار دیواری کی دُنیا کی ٹریجیڈی بھی کہہ سکتے ہیں۔

میری شادی آزادی سے پہلے ہو گئی تھی، اور میں اپنی بیوی کی پسند کا خاوند نہیں تھا۔ مجھ میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ میں غریب تھا اور میری بیوی کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی تھی۔ ایسا جوڑ شاید کبھی نہ ملتا لیکن برادری اور قریبی رشتہ داریوں کی زنجیروں نے ہمیں جکڑ لیا۔ نہ وہ کہہ سکی کہ میں ایسے آدمی کی بیوی نہیں بنوں گی جس کی تنخواہ کم ہے، اور میں بھی نہ کہہ سکا کہ ہمارا گھرانہ ایسے گھرانے کے قابل نہیں جو مالی لحاظ سے ہم سے بہتر ہے۔ دونوں خاندانوں میں چونکہ پہلے سے رشتے ناطے لئے دیئے گئے تھے اس لئے میرا رشتہ اس لڑکی کے ساتھ رواج اور پابندیوں کے تحت از خود ہی طے ہو گیا۔

میرے والد صاحب مرحوم پاکستان سے پہلے فوج میں حوالدار کلرک تھے۔ اُن کی پنشن بہت ہی کم تھی۔ پنشن پر آکر انہوں نے چھوٹی سی دکان کھول لی تھی اور میں سکول ٹیچر تھا۔ میرا ایک بھائی مجھ سے چھوٹا تھا جو میری شادی کے وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ایک بہن کی شادی ہونے والی تھی۔ دوسری اُس سے دو تین سال چھوٹی تھی۔ میری والدہ بھی تھیں۔ میری بیوی نے میرے ساتھ بدسلوکی نہیں کی اور یہ بھی زبان پر نہ لاتی کہ اُسے ہمارا گھر یا میں پسند نہیں لیکن اُس کا انداز بتاتا تھا کہ وہ خوش نہیں۔ میں اور میرے والد صاحب پیٹ باندھ کر پیسہ پیسہ بچاتے تھے اور بہن کے جہیز کی کوئی چیز بنا لیتے تھے۔ چھوٹے بھائی کو چونکہ میں نے اپنے سکول میں داخل کرا رکھا تھا اس لئے اُس کی فیس معاف تھی۔ ہیڈ ماسٹر کو میری مالی مجبوریوں کا علم تھا۔

میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ بہن کا بوجھ ہمارے کندھوں پر تھا لیکن والدین اس میں اپنی بے عزتی سمجھتے تھے کہ بیٹا جوان ہو، برسرِ روزگار ہو اور اُس کی شادی نہ ہو۔ میری والدہ کہا کرتی تھیں کہ لوگ کہیں گے کہ برادری میں انہیں کوئی بیٹی نہیں دیتا۔ اُدھر بیٹی والے زور دیتے تھے کہ جواب دو یا جلدی کرو، جوان بیٹی کو گھر میں بٹھانا ٹھیک نہیں۔ یہ میرا خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نے شادی کس طرح کی تھی۔ اگر کوئی میرے حالات دیکھتا اور میری سُنتا تو ہم نکاح خواں اور دو گواہوں کو بلا کر نکاح پڑھا لیتے مگر لڑکی والوں نے کہا کہ بارات تھوڑی نہ ہو۔ اُن کی حیثیت کے مطابق یعنی زیادہ ہو۔ برادری تھوڑی تو نہیں تھی۔ بارات ایک سو بیس آدمیوں اور بیس عورتوں کی ہو گئی۔ مجھے معلوم نہیں کہ ولیمہ کی رسم کس نے شروع کی تھی۔ برادری کو اپنے گھرانوں اور اپنے افراد کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ ہمارے گھر کی حالت سبھی جانتے

تھے۔ کسی ایک نے بھی نہ کہا کہ ولیمے کی عیاشی نہ کرنا ورنہ رگڑے جاؤ گے۔ سب یہ توقع لگائے بیٹھے تھے کہ میں "گج وج" کر ولیمہ دوں گا۔ برادری کے بزرگوں نے مجھ سے پوچھے بغیر مجھے مہمانوں کی فہرست دے دی اور یہ بھی بتایا کہ کھانے میں کیا کیا ہو۔

ہم نے ولیمہ بھی دیا۔ مکان نہیں بیچا، باقی کوئی کسر نہ رہی۔ ماں نے اپنے وقتوں کے خالص سونے کے زیورات رکھے ہوئے تھے۔ وہ سب فروخت ہو گئے۔ اِدھر اُدھر سے اتنا قرض لیا کہ ہم خود فروخت ہو گئے۔ ابھی بہن کی شادی ہونے والی تھی۔ میری والدہ بہت خوش تھیں کہ برادری میں ناک رہ گئی ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ ہم کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ برادری کے چوہدریوں جیسی شادی کی ہے مگر ہم بہت پیچھے چلے گئے تھے۔ ضرورت بچت کی تھی مگر ہم باقی عمر کے لئے قرضوں میں بندھ گئے۔

میں نے اپنی دلہن کو زندگی کی رفیقہ اور دُکھ سُکھ کی شریک سمجھ کر صاف گوئی سے بتا دیا کہ ہماری مالی حالت کیا ہو گئی ہے۔ اُس نے سرد مہری سے کہا ——"آج کل ماسٹر گھر بھی لڑکوں کو پڑھانے ہیں۔ آپ بھی کچھ لڑکے جمع کر لیں"

—— میں نے کہا کہ قرض زیادہ ہے تو اُس نے کہا ——"میں اپنا زیور تو آپ کو دے نہیں سکتی۔ مکان بیچ ڈالیں"۔

اُس کا لہجہ طنزیہ نہیں تھا لیکن میں نے یہ جان لیا کہ وہ رفیقۂ حیات تو بنا دی گئی ہے لیکن میرے دُکھ سکھ کی شریک بننے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے بعد میں نے اُسے اپنی مالی حالت نہ بتائی۔ میں نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ اُسے میرے ساتھ جذباتی لگاؤ بھی نہیں۔ پہلے تو اپنے آپ کو یہ دھوکہ دیا کہ اُس کی عادت ہی ایسی ہو گی۔ پردہ نشین لڑکیاں عموماً گھٹی گھٹی سی ہوتی ہیں اور خاوندوں کے ساتھ بے تکلف ہونے سے بھی جھینپتی ہیں۔ میں نے اپنے آپ سے یہ بھی کہا کہ لڑکی ابھی نوجوان ہے، کھاتے پیتے گھرانے سے آئی ہے اس لئے ابھی ان تلخیوں کو قبول نہیں کر رہی جن سے مجھے واسطہ آ پڑا ہے۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ اُسے ایسی تلخ باتوں سے پریشان نہیں کروں گا۔

تھوڑے ہی عرصے بعد گھر میں وہی بدمزگی پیدا ہو گئی جس سے ہمارے گھروں میں رونق رہتی ہے۔ یہ تھا ساس بہو کا آئے دن کا جھگڑا۔ میں نے دو لڑکوں کی ٹیوشن کر لی تھی۔ اُن کے گھر میں جا کر پڑھانا ہوتا تھا۔ اُجرت کُل ساٹھ روپے تھی۔ سارا دن سکول میں پڑھانا پھر ایک لڑکے کے گھر، اس کے بعد دوسرے کے گھر جانا۔ شام کو دماغ تھکن سے بیکار ہو چکا ہوتا تھا۔ میں گھر میں سکون اور ذہنی آسودگی حاصل کرنے کی امید لے کر داخل ہوتا تھا مگر وہاں بیوی کے ماتھے پہ شکنیں ہوتی تھیں۔ ماں کا مُنہ سُوجا ہُوا ہوتا تھا اور میری دونوں بہنیں پریشان اور اُداس نظر آتی تھیں۔ والد صاحب تھکے ہارے الگ پڑے ہوتے تھے۔ گھر کی فضا کو اس عالم میں دیکھ کر میری بھُوک ماری جاتی تھی۔

پھر اذیت کا اگلا دَور شروع ہوتا تھا۔ ماں کی یہ کوشش کہ میں اُس کے پاس بیٹھوں اور اُس کی سُنوں۔ وہ میری ماں تھی۔ میں پہلے اُسی کی سُنتا تھا۔ وہ مظلوم بن کر سُناتی تھی کہ میری بیوی اُس کی عزت نہیں کرتی اور گھر کے کام کاج میں بھی دلچسپی نہیں لیتی۔ یہ الزام ثابت کرنے کے لئے وہ تین چار واقعات یا باتیں سُنا دیتی تھی۔ میں اُسی کو سچا سمجھ کر اُٹھتا اور اپنی بیوی کے پاس جا بیٹھتا۔ پیشتر اس کے کہ میں اُسے کچھ کہتا وہ مُنہ بسور لیتی، خاموشی سے ناراضگی کا اظہار کرتی اور میں اسی سے پریشان ہو جاتا۔ کئی بار پوچھنے اور منانے کے بعد وہ ماں سے بالکل اُلٹ کہانی سُنا دیتی، بعض اوقات رو بھی پڑتی۔ میری وہ بہن جس کی شادی ہونے والی تھی، مجھے بتا دیتی کہ بات اتنی سنگین نہیں تھی جتنی امّی اور بھابھی نے سنائی ہے۔ بات بالکل معمولی سی تھی۔

ملک میں آزادی کے معرکے زور و شور سے لڑے جا رہے تھے۔ آپ یہ معرکے قارئین کو سُناتے رہتے ہیں۔ میں قوم سے ہمیشہ شرمسار رہوں گا کہ میں نے آزادی کے جہاد میں اپنا فرض ادا نہیں کیا۔ میرے سکول کے بچے بھی اس جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ پاکستان کے اِیشو پہ قوم نے الیکشن لڑا تو سکول کی حاضری کم ہو گئی تھی۔ خصوصاً نویں دسویں جماعت کے طلبا پولنگ سٹیشنوں پر چلے جاتے اور مختلف کام سنبھال لیتے تھے۔ میرا خون کھولتا

رہتا لیکن میں گھر کے معرکوں میں اُلجھا رہتا تھا یا ٹیوشنیں پڑھانے میں
مصروف رہتا۔

پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔ میں قوم کی مسرتوں میں برابر کا شریک تھا۔
حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی جتنی خوشی مجھے ہوئی اتنی قوم کو نہیں ہو سکتی تھی۔
اس کی وجہ یہ تھی کہ والد صاحب نے دو ہندو ساہوکاروں سے قرض لیا تھا۔ یہ
دونوں قرضے ہمیں اس وجہ سے زیادہ پریشان کرتے تھے کہ ہم ہر ماہ صرف
سُود ادا کرتے تھے۔ اصل زر جُوں کا تُوں واجب الادا تھا۔ پاکستان کے ظہور کے
ساتھ ہندو ہندوستان کو سدھار گئے اور ہم ان سُودی قرضوں سے آزاد
ہو گئے۔ ہم نے کچھ رقم اپنے عزیز رشتہ داروں سے بھی لی تھی۔ اس کی
بالا اقساط ادائیگی شروع کر دی۔ انتہائی نامساعد حالات میں بہن کی شادی کر دی۔
پھر دوسری بہن کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

میرا پہلا بچہ پیدا ہوا۔ اُس وقت تک میرے گھر کے سیاسی حالات اتنے
زیادہ بگڑ چکے تھے کہ ایک شام میں گھر گیا تو مجھے بتایا گیا کہ میری بیوی نے آج
ہانڈی روٹی الگ کی ہے۔ میں نے روزمرہ کی طرح ماں کی الگ سُنیں اور بیوی
کی الگ سُنیں۔ بہن نے مجھے الگ کر کے بتایا کہ میری بیوی مجھے ماں باپ اور
بہن بھائیوں سے الگ کرنا چاہتی ہے۔ وہ تو اب مجھ سے بھی کھچی کھچی رہنے لگی
تھی۔ میں نہ بیوی کو کچھ کہتا تھا نہ ماں کو۔ والد صاحب نے تو جیسے گھر والوں سے
قطع تعلق کر لیا تھا۔ بے چارے بوڑھے ہو گئے تھے۔ میں اُستاد تھا۔ تعلیم یافتہ تھا۔
بچوں کو اتفاق، اتحاد اور حُسنِ سلوک کے سبق پڑھاتا تھا مگر میرے اپنے گھر کا یہ
عالم تھا کہ وہاں اتفاق تھا نہ اتحاد اور نہ حُسنِ سلوک۔ میں نے جو باتیں پڑھی تھیں
وہ بے معنی اور بے کار نظر آنے لگیں اور زندگی سے دل اُچاٹ ہو گیا۔ مجھے
افسوس اس پہ آتا تھا کہ نہ ماں کے دل میں اپنے بیٹے کی محبت رہی تھی نہ بیوی کے
دل میں اپنے خاوند کے سکون کا احساس رہا تھا۔ مجھے دونوں دشمن نظر آتی تھیں۔ میں
اخباروں میں کبھی کبھی یہ خبر پڑھا کرتا تھا کہ فلاں آدمی نے گھریلو جھگڑوں سے تنگ
آ کر خودکشی کر لی ہے۔ میں کہا کرتا تھا کہ جاہل آدمی تھا جو جھگڑے ختم کرنے کی بجائے
دنیا سے ہی بھاگ گیا۔ اگر یہ جھگڑے میرے گھر میں آ گئے تو میں نے ایک روز یہی
علاج سوچا کہ اپنے آپ کو ختم کر لوں مگر بچے کا خیال آ گیا۔ شاید یہ وجہ بھی تھی کہ
میں بُزدل تھا۔

اب اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ گھر میں وجہ پیکار کیا تھی تو میں کچھ بھی نہیں بتا
سکتا۔ کوئی جائیداد کا جھگڑا نہیں، خونی دشمنی بھی کوئی نہیں تھی مگر معلوم ہوتا تھا جیسے
میری بیوی اور میری ماں ایک دوسری کے خون کی پیاسی ہیں، لیکن خون صرف
میرا خشک ہوتا تھا۔ میری ترقی کے راستے کھُلے تھے لیکن میری صلاحیتیں ختم ہو
چکی تھیں۔ میرے سُسرال والے الگ میرے سر پہ پاؤں رکھے رہتے تھے۔
بچے کی پیدائش کے بعد دوسری اچھی خبر یہ سُنی کہ سکول والوں نے مجھے ترقی دے
دی ہے اور میں تھرڈ ماسٹر بنا دیا گیا ہوں۔ تنخواہ میں بھی اضافہ ہو گیا۔ میں نے
ہیڈ ماسٹر سے درخواست کی کہ مجھے کہیں مکان دلا دیں جہاں میں اپنی بیوی اور بچے
کے ساتھ الگ رہوں۔ میں ہیڈ ماسٹر سے یہ درخواست کرتے ہوتے رو پڑا تھا۔
اُسے گھر کی سیاسی صورتِ حال بتائی۔ اُس نے اپنے اثر و رسوخ سے کرائے
کا مکان دلانے کا وعدہ کیا اور کہا کہ مجھے الگ ہو جانا چاہیئے۔

"بڑے بڑے ذہین لوگ گھروں کے ان بے بنیاد جھگڑوں میں نیم پاگل
ہو جاتے ہیں" — ہیڈ ماسٹر نے کہا — "میں دیکھ رہا تھا کہ آپ میں وہ جوش و خروش
نہیں رہا جو شادی سے پہلے ہُوا کرتا تھا۔ آپ بھی اُسی حادثے کا شکار ہو رہے
ہیں جو ہمارے گھرانوں میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہم لوگ جنگلی ہیں۔ ماں اپنے بیٹے
کو کھا جاتی ہے کہ بہو کے دل کو تکلیف پہنچے اور بیوی اپنے خاوند کو کھا جاتی ہے
کہ ساس سر پہ ہاتھ رکھ کر بَین کرے۔ ان گھرانوں کے بچے ساری عمر صرف
زندہ رہتے ہیں، قوم کے کسی کام نہیں آ سکتے۔"

میں نے کرائے پر مکان لے لیا اور بیوی کو وہاں لے گیا مگر اُس نے
نیا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ اپنے جہیز کا فرنیچر تو وہ اپنے ساتھ لے آئی تھی نئے مکان
میں ضد کرنے لگی کہ میں گھر کے سامان کی تقسیم کر کے اپنا حصہ لے آؤں۔ میں
چند ایک برتن لے آیا اور اُسے کسی نہ کسی طرح سمجھا بجھا لیا۔ میں نے اُس سے یہ

بھی منوالیا کہ میں گھر والوں کو تھوڑی سی رقم ہر ماہ دیا کروں گا، ورنہ لوگ مجھ پر لعنت بھیجیں گے۔ اُسے علیٰحدگی کی اتنی خوشی تھی کہ وہ مان گئی، مگر گھر میں اُس نے امیرانہ ٹھاٹھ شروع کر دی۔ کہتی تھی کہ گوشت کا ناغہ نہ ہو۔ کپڑے اچھے پہنے جائیں۔ گھر میں اِدھر اُدھر کی عورتیں آئیں تو اُن کی خاطر تواضع کی جائے۔ سب سے بڑی مشکل یہ پیدا ہو گئی تھی کہ رشتہ داروں میں کہیں شادی ہوتی تھی اور کہیں ختنہ، کہیں ماتم ہوتا تھا اور کہیں خوشی کا موقع۔ میری بیوی وہاں بے دریغ پیسے دے آتی تھی۔ وہ برادری میں سر اُونچا رکھنا چاہتی تھی۔

قائدِ اعظم فوت ہو چکے تھے اور پاکستان اُس تباہی کے راستے پر چل پڑا تھا جس سے ہم آج دوچار ہیں۔ تعلیمی اداروں میں رشوت چل پڑی تھی۔ پرچے آؤٹ ہونے لگے۔ ممتحن پیسے لے کر زیادہ نمبر دے دیتے تھے۔ امتحانوں میں پیسے لے کر نقل کرانے کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ میرے اپنے سکول میں یہ ناجائز کاروبار ہو رہا تھا لیکن میں نے اپنے آپ کو اس سے پاک رکھا۔ میں اپنی بیوی کو بڑے افسوس کے ساتھ بتایا کرتا تھا کہ اپنے معزز اور قابلِ احترام پیشے میں رشوت خوری عام ہو گئی ہے۔ میں اُسے وہ طریقے بھی بتایا کرتا تھا جن سے اُستاد پیسہ کماتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ میری بیوی نے اس دھاندلی پر کبھی افسوس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پھر اُس نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جو اُستاد مالی پریشانیوں سے دوچار ہیں وہ یہ دھندا نہ کریں تو زندہ کیسے رہیں۔

ایک بار میں نویں جماعت کے سالانہ امتحان کے پرچوں پر نمبر لگا رہا تھا۔ میری بیوی نے پوچھا کہ کتنے لڑکے فیل ہو رہے ہیں۔ میں نے بتایا کہ پڑھائی کا معیار اِس قدر گر گیا ہے کہ آدھے لڑکے فیل ہیں۔ بیوی نے کہا کہ یہ لال پنسل آپ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر آپ چاہیں تو لڑکوں کا کام بھی بن سکتا ہے اور ہمارے دن بھی پھر سکتے ہیں۔ میں اُس کا مطلب سمجھ گیا۔ میری آمدنی اُس کی امیرانہ ٹھاٹھ کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھ پر ابھی ایک بہن کی ذمہ داری تھی۔ کچھ قرض بھی باقی تھا۔ بچہ تین سال کا ہو گیا تھا۔ بازار کے بھاؤ چڑھتے جا رہے تھے۔ پھر بھی میں وہ سوچ نہیں سکتا تھا جو بیوی نے کہہ دیا تھا۔ اُس نے ایک

ہی رٹ نہ کہہ کر بات ختم نہ کی۔ وہ تو میرے پیچھے پڑ گئی کہ میں آمدنی کے اِس ذریعے سے فائدہ اٹھاؤں۔

میں مزاحمت کرتا رہا اور وہ مجھے رشوت خوری پر اُکساتی رہی۔ مجھے مجبور کرنے کے لئے اُس نے اخراجات اور زیادہ بڑھا دیئے۔ حتیٰ کہ ایک سال گزر گیا۔ پاکستان بننے سے پہلے سکولوں میں یہ رواج تھا کہ میٹرک کے امتحان کے لئے ہر طالب علم کا داخلہ نہیں بھیجا جاتا تھا۔ آزمائشی امتحان لیا جاتا تھا جو بہت سخت ہوتا تھا۔ جو فیل ہو جاتا اُس کا داخلہ نہیں بھیجا جاتا تھا۔ ہر سکول کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ میٹرک میں اُس کا کوئی لڑکا فیل نہ ہو۔ پاکستان بننے کے بعد تک ہم نے اپنے سکول میں یہ رواج قائم رکھا۔ کئی ایک سکولوں میں نالائق لڑکے رشوت سے امتحان میں چلے جاتے اور رشوت کے زور پر پاس بھی ہو جاتے تھے۔

ہمارے سکول میں داخلے کے لئے امتحان ہُوا۔ انگریزی اور ریاضی کے پرچے میرے پاس آئے۔ اس سے چند روز پہلے میرے بچے کو پیٹ میں ایسی تکلیف ہوتی کہ قے اور دست رُکتے نہیں تھے۔ علاج سے ذرا بہتر ہوتا پھر وہی حالت ہو جاتی۔ چند دِنوں میں بچہ ہڈیوں کا پنجر بن گیا۔ دو ڈاکٹروں کا علاج کرایا مگر کوئی اثر نہ ہُوا۔ علاج اتنا مہنگا تھا کہ میں گھبرا گیا۔ کسی نے ایک سپیشلسٹ کا پتہ دیا اور بتایا کہ اُس کی فیس بتیس روپے ہے۔ اُن دِنوں بتیس روپے خاصی رقم سمجھی جاتی تھی۔ فیس کے بعد علاج کے لئے رقم درکار تھی۔ میں بہت پریشان تھا اور ابھی اسی فیصلے پر قائم تھا کہ پہلے والے ڈاکٹر کا علاج کراتا رہوں گا۔

ایک شام میں گھر گیا تو بیوی نے ایک آدمی کا نام بتا کر کہا کہ وہ آیا تھا۔ کہتا تھا کہ میرے بیٹے کو انگریزی اور ریاضی میں فیل نہ کرنا۔ آپ جو خدمت کہیں گے کروں گا۔ میں اُس آدمی کو جانتا تھا۔ روپے پیسے والا آدمی تھا اور اُس کا بیٹا نالائق۔ وہ اپنے بیٹے کا داخلہ بھجوا کر اُسے پیسے کے زور سے پاس کرانے کا ارادہ کئے ہوئے تھا۔ میں نے اپنی بیوی کو اُس کے لڑکے کے پرچے دکھا کر بتایا کہ سَو میں سے اکیس نمبر لینے والے کو میں کیسے پاس کر سکتا

ہوں۔ بیوی مجھے قائل کرنے کے لئے دلیلیں دینے لگی۔ میں نے اُس کی کوئی دلیل قبول نہ کی۔ اُس نے مجھے اپنے بیمار بچے کا واسطہ دے کر کہا کہ گھر میں علاج کے لئے پیسے نہیں، اسی کی خاطر اس آدمی سے کچھ رقم لے لیں۔ میں نے آخر غصّے سے کہا ——— "مر جاتے بچے، میں ایمان نہیں بیچوں گا۔"

میں نہیں سمجھ سکتا کہ خدا نے میرے ایمان کی پختگی کا پاس کیوں نہیں رکھا۔ مجھے کم از کم ایک سَو روپوں کی شدید ضرورت تھی۔ یہ میرا پہلا اور ایک ہی بچہ تھا۔ میں نے اس بچے کی قسم کھائی تھی مگر کوئی معجزہ نہ ہُوا۔ اُسی رات بچے کی حالت بگڑ گئی۔ رات کو کوئی ڈاکٹر نہ مل سکا۔ رات بچے کے ساتھ جاگتے گزر گئی۔ بچے کی بگڑتی ہوئی حالت کے ساتھ بچے کی ماں بار بار اور مجھے کوس کوس کر کہتی رہی کہ میں رقم لے کر اس لڑکے کو پاس کر دوں ورنہ کل ہم ڈاکٹر کے پاس نہیں جا سکیں گے۔ صبح ہوئی۔ میرا دماغ بچے کی حالت سے اور ساری رات جاگنے سے بے کار ہو چکا تھا۔ میں نے بیوی سے کہا کہ گھر میں جو پیسے ہیں وہ دے دو تاکہ میں بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں۔ بیوی نے رو رو کر دے کر کہا ——— "کہیں سے اُدھار لے لو۔ گھر میں یہی کچھ ہے۔"

میں سوچ رہا تھا کہ اُدھار کس سے لوں کہ دروازہ کھٹکا۔ میں نے کھولا تو وہی آدمی کھڑا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی میں نے اُسے کہا کہ میں اپنا اصول اور اپنا ایمان برباد نہیں کروں گا۔ اُس نے منت کی کہ یہ اُس کا ایک ہی بچہ ہے جو بے جا پیار سے بگڑ گیا ہے۔ آپ اس کا داخلہ بھیج دیں۔ آگے پاس کرانا میرا کام ہے۔ میں انکار کرتا رہا، وہ منت سماجت کرتا رہا۔ دروازے کے پیچھے سے میری بیوی کی آواز آئی ——— "اپنے بچے کی زندگی چاہتے تو ان کے بچے کا مستقبل خراب نہ کریں۔ بچے کی حالت بگڑ رہی ہے۔ ڈاکٹر کے پاس جلدی جائیں۔"

اُس شخص نے سُنا تو بولا ——— "میں ڈاکٹر کو یہیں لے آتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں" ——— اُس نے کہا ——— "آپ گھبراتے کیوں ہیں۔ کوئی پیسے لے کر کام نہیں کرنا۔ آپ نہیں کریں گے تو میں ہیڈ ماسٹر سے کروا لوں گا۔"

پھر یُوں ہُوا کہ دروازے کے پیچھے میری بیوی کی رندھیائی ہوئی آوازیں

اور دروازے کے باہر اس شخص کی باتیں، اس کے ساتھ اپنے بچے کا خیال اور رات بھر جاگتے رہنے سے اور بچے کی تیزی سے بگڑتی حالت دیکھ دیکھ کر میرا دماغ ماؤف، میں آندھی میں تنکے کی طرح اُڑ گیا۔ میرا ہاتھ اُس شخص کے آگے پھیل گیا اور میرے مُنہ سے نکلا ——— "ڈیڑھ سو روپیہ۔"

وہ مجھے ڈیڑھ سو روپیہ دے کر چلا گیا۔ میں نے بیوی سے کہا ——— "بچے کو اُٹھا لاؤ" ——— وہ بچے کو اُٹھا لائی۔ میں اُسے اُٹھا کر ڈاکٹر کی طرف چل پڑا۔ اتنی سویرے کسی ڈاکٹر کی دکان نہیں کھُلی تھی۔ میری جیب میں پیسے تھے۔ میں ایک ڈاکٹر کے گھر چلا گیا۔ وہ مل گیا۔ اندر جا کر بچے کو اُس کے صوفے پر لٹایا۔ ڈاکٹر نے بچے کی نبض پر ہاتھ رکھا اور میری طرف دیکھا۔ میں نے بیماری کی تفصیل سُنانی شروع کی تو ڈاکٹر نے کہا ——— "بچہ راستے میں فوت ہُوا ہے یا آپ ٹُنک میں اُٹھا لائے ہیں؟"

"فوت ہے" ——— یہ ایک دھاڑ تھی جو میرے مُنہ سے نکلی اور میں بچے پر گر پڑا۔

میں جب بچے کی میت گھر لایا تو آپ جان سکتے ہیں کہ میری بیوی کی کیا حالت ہوئی ہو گی۔ میرا ذہن صاف ہو چکا تھا اور میری آنکھیں کھُل گئی تھیں۔ میں نے اپنی بیوی کے ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں دیکھیں۔ انگلیوں میں دو انگوٹھیاں دیکھیں۔ کانوں میں کانٹے دیکھے۔ یہ تمام زیورات سونے کے تھے۔ میں اندھا ہو گیا تھا۔ ان زیورات کا مجھے پہلے خیال نہیں آیا تھا۔ میں بیوی پر برس پڑا۔ میں نے آسمان سر پہ اُٹھا لیا۔ اُسے کہا کہ تُو ماں نہیں چڑیل ہے۔ بیوی نہیں طوائف ہے۔ تُو نے بچے کی خاطر یہ سونا نہیں بیچا، میرا ایمان بیچ ڈالا۔ تُو مجھے حرام خوری کا عادی بنانا چاہتی تھی۔ خدا نے تیرے ساتھ مجھے بھی سزا دی ہے۔

جب بچے کے کفن دفن کا وقت آیا تو بیوی نے اپنے ٹرنک سے مجھے اڑھائی سو روپیہ نکال کر دیا اور میرے پاؤں میں بیٹھ کر بولی ——— "مجھے معاف کر دینا" ——— وہ ماں تھی۔ بچے کی موت نے اُس کی امیرانہ خیالی اور کجروی ختم کر دی تھی۔

اس کے بعد خدا نے مجھے لڑکا نہیں دیا۔ دو لڑکیاں دیں۔ بیوی دو سال گزرے فوت ہو گئی ہے۔ بچے کی وفات کے بعد وہ بالکل ہی بدل گئی تھی۔ میری خدمت غلاموں کی طرح کرتی تھی۔ اُس نے میرے ماں باپ کی بھی بہت خدمت کی اور اُن سے اُس نے سارے گناہ بخشوا لئے۔ وہ اس دنیا سے اُسے دعائیں دیتے ہوتے رخصت ہوتے۔

میں نے تمام عمر رشوت نہیں لی مگر اپنا جو بھی کام کرایا رشوت دے کر کرایا اور اکثر سوچتا ہوں، کیا خدا کی بے آواز لاٹھی بے جان ہو گئی ہے؟

خدمت میں عظمت

Naved ur Rahman Baig

+92 314 9077218